پرستش

طاہر جاوید مغل

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور - فون ۷۳۲۴۷۳۱۴

محبت کے موضوع پر جو کہانیاں میں نے لکھی ہیں یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے جسے میں بہت قریب سے جانتا ہوں۔

وہ بہت عقلمند تھا۔

اس کے ہاتھ ہر وقت اپنے "نفع و نقصان" کی نبض پر رہتے تھے۔

پھر اسے ایک پجارن سے محبت ہوئی۔

اس محبت نے اسے بتایا کہ عقل ہی سب کچھ نہیں،

نفع و نقصان ہی زندگی کا حاصل نہیں،

کبھی کبھی ایک خوبصورت نادانی بھی پوری زندگی سنوار دیتی ہے۔

والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو مجھے فوری طور پر شہر چھوڑ کر گاؤں کا رخ کرنا پڑا۔ گاؤں میں ہماری کافی زمین تھی۔ کئی گودام تھے۔ ایک بہت بڑا پولٹری فارم اور مچھلی فارم تھا۔ اپنی زندگی میں والد صاحب کی شدید خواہش رہی کہ میں گاؤں آجاؤں اور زمینداری میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میں نے بالکل مختلف مزاج پایا تھا۔ درحقیقت اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شہر رنگ و بو لاہور میں گزارنے کے بعد میں دیہی ماحول اور زندگی سے کوسوں دور جا چکا تھا۔ میں انجینئرنگ میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن ناکامی کے بعد بی ایس سی کیا اور پھر صنعت و حرفت میں اپنی دلچسپی کے سبب ایک چھوٹی سی فاؤنڈری کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فاؤنڈری دن بہ دن ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی مگر اچانک والد صاحب حادثے کا شکار ہو گئے۔ خوشاب سے لاہور آتے ہوئے ان کی کار ایک راہ گیر کو بچانے کی کوشش میں بس سے جا ٹکرائی۔ والد صاحب اور ان کا ایک ملازم رب نواز موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ ایک وکیل صاحب اور ایک ملازم کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔

گاؤں میں پہنچتے ہی مجھ پر ذمے داریوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ زمین کے معاملات‘ فارموں کی دیکھ بھال‘ ملازمین کے تنازعے‘ رشتے داروں کی ریشہ دوانیاں‘ یہ سب کچھ جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مصروفیت کی اس تند و تیز آندھی میں میرا شوق خزاں رسیدہ پتے کے مانند نجانے کہاں اڑ گیا۔ لاہور میں مجھے اپنا کام پہلے بند اور پھر ختم کرنا پڑا۔ یوں میں نے زراعت کے بجائے صنعت کو ذریعہ معاش بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ ابتدائی مراحل میں ہی چکنا چور ہو گیا۔ اب میں تھا‘ آبائی حویلی تھی اور حویلی کے جھمیلے تھے۔ مجھے چھوٹے مالک‘ کا خطاب دے کر عزت و احترام کی ایک ایسی مسند پر بٹھا دیا گیا تھا جس کے میں ہرگز لائق نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایک آزاد خیال اور رنگین طبع شخص تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ میں دو جمع دو چار کا قائل تھا۔ ہر

معاملے میں حقیقت پسندانہ رویہ اپناتا تھا' حتیٰ کہ شدید رومانی معاملات میں بھی میں نے کبھی ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ شہر میں' میں نے بڑا بھرپور وقت گزارا تھا۔ ہر ہر لمحے سے مسرتیں کشید کی تھیں لیکن گاؤں میں یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ یہاں کے اور شہر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اوپر سے میرے سر پر ادب و احترام کا جو پگڑ رکھ دیا گیا تھا وہ مجھے گردن ادھر ادھر گھمانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس صورت حال پر ہزار بار لعنت بھیج چکا تھا لیکن فوری طور پر چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

ہماری حویلی میں ایک لڑکی رابعہ عرف رابو کام کرتی تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اگر اس کے چہرے پر کوئی چیز خوبصورت کہی جا سکتی تھی تو وہ ہونٹ تھے۔ لگتا تھا یہ ہونٹ کسی حسین و جمیل لڑکی کے چہرے سے اٹھا کر رابو کی ناک کے عین نیچے رکھ دیئے گئے ہیں۔ گداز' رسیلے اور لرزاں ہونٹ' جنہیں دیکھ کر دل میں کھد بد سی ہونے لگتی تھی۔ رابو کی عمر بمشکل سولہ سال رہی ہوگی۔ رنگ گندمی تھا' بال لمبے مگر خشک اور الجھے الجھے سے۔ جسم عام لڑکیوں جیسا تھا۔ یعنی جیسا عام لڑکیوں کا کپڑوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میں اکثر اسے اپنے قرب و جوار میں دیکھ چکا تھا لیکن کبھی زیادہ غور نہیں کیا۔ شاید اس میں زیادہ غور کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی اور ویسے بھی اب میں "چھوٹے مالک" تھا' ایسی عام سی لڑکی کے بارے میں اپنے ذہن کو سوچنے کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں یہ لڑکی میری زندگی میں کیا اہمیت اختیار کرنے والی ہے۔

میرے بارے میں' دوستوں میں مشہور تھا کہ جہانداد اصولوں ضابطوں کا بہت پابند ہے اور اگر اسے کسی سے ہاتھا پائی بھی کرنی ہو تو ہاتھا پائی کے لئے مخصوص ڈریس پہن کر جاتا ہے۔ یہ بات درست بھی تھی' میں ہر کام میں قرینے کا خواہشمند رہتا تھا۔ ایک روز میں منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے برآمد ہوا تو میرا تولیا اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ تولیے کی عدم موجودگی مجھے ہمیشہ سے آگ بگولا کر دیتی ہے۔ میں نے ماماں کو ڈانٹ کر پوچھا کہ تولیا کہاں ہے۔ حویلی کی سب سے تجربہ کار ملازمہ ہونے کے باوجود وہ سہم گئی۔ گھبرا کر بولی۔

"میں نے رابو سے کہہ دیا تھا کہ تولیا غسل خانے کے باہر لٹکا دے۔" پھر وہ رخ پھیر کر رابو کو آوازیں دینے لگی "رابو........ او رابو' کہاں مر گئی ہے۔ ادھر آ جلدی

ہے۔"

چند ہی لمحے بعد رابو تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ حسب معمول اس کے سر پر سلوٹوں والی سفید اوڑھنی تھی۔ وہ حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ماماں کو دیکھنے لگی۔ ماماں نے ساری ذمے داری رابو پر تھوپتے ہوئے گرج کر کہا۔ "حرام خور' کلموہی' صبح تجھے کہا نہیں تھا' چھوٹے مالک کا تولیا ان کے کمرے میں رکھ آ۔"

رابو ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ "جی........ وہ میں........ وہ میں بھول گئی تھی۔ دراصل ماں........" کچھ کہتے کہتے آواز رابو کے گلے میں اٹک گئی۔

"کیا ہوا' تیری ماں کو؟" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے مالک! ماں کو بخار آ رہا ہے۔ چار پانچ دنوں سے........ کل ایک دم ان کی طبیعت جیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے پتا چلا تو میں گھبرا کر جلدی سے گھر چلی گئی۔ تت........ تولیے کا یاد ہی نہیں رہا۔"

"اچھا کوئی بات نہیں۔ آئندہ دھیان رکھنا........ اب کیا حال ہے تمہاری ماں کا؟"

"پہلے سے اچھا ہے جی۔" رابو نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا........ ٹھیک ہے جاؤ۔" میں نے کہا۔ وہ تشکر آمیز انداز میں سر جھکا کر باہر چلی گئی۔

میرا نرم رویہ دیکھ کر بوڑھی ماماں نے بھی اپنے تیور درست کر لئے۔ بولی "ویسے تو بڑی محنتی ہے جی۔ مسین کی طرح کام کرتی ہے۔ پر آج کل ماں کی وجہ سے جرا پریسان رہتی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھا دوں گی۔"

میں نے ماماں کے خوشامدی لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں سے آتی ہے؟"

ماماں حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی "آنا کہاں سے ہے جی۔ یہیں رہتی ہے حویلی کے پچھواڑے........ رب نواز کی بیٹی ہے۔"

میں اس اطلاع پر چونکا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے میں کتنا بے خبر ہوں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رب نواز اس ملازم کا نام تھا جو والد صاحب کے ساتھ حادثے میں جاں بحق ہوا۔ والد صاحب کے بقول یہ شخص ہمارا جدی پشتی ملازم تھا۔ غالباً رب نواز کا دادا ہمارے پردادا کی حویلی میں کام کرتا تھا اور یہ

تعلق اس سے پہلے بھی قائم تھا۔ یہ لوگ دیندار نامی ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ رب نواز کا دادا قتل کے کسی جھوٹے مقدمے میں انگریزوں سے سزائے موت پانے والا تھا۔ ہمارے پردادا نے اپنے اثر و رسوخ سے اس کی جاں بخشی کرائی۔ اس کے بعد اس شخص نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ حویلی کا خدمت گزار رہے گا اور اس خدمت کے بدلے میں کوئی نقد معاوضہ بھی قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے پردادا بارسوخ زمیندار ہونے کے علاوہ ایک بڑے عالم دین بھی تھے۔ ہندو' سکھ غرض ہر مذہب کے لوگ ان کی توقیر کرتے تھے۔ والد صاحب بتاتے تھے کہ رب نواز کے دادا نے اپنی بیوی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہر صبح اپنے بالوں سے حویلی کے دیوان خانے میں جھاڑو دیا کرے یہ اور اس قسم کی کئی اور باتیں رب نواز کے خانوادے سے منسوب تھیں۔ اس خانوادے کے تین چار افراد اب بھی ہماری حویلی میں مختلف کام کرتے تھے۔ ان میں "ماماں" بھی شامل تھی۔ یہ رشتے میں رابو کی خالہ تھی۔

دھیرے دھیرے بالکل غیر محسوس طور پر میں رابو میں دلچسپی لینے لگا۔ میں اسے کن انکھیوں سے کام کاج کرتے دیکھتا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے محظوظ کرتی۔ وہ کسی دن نظر نہ آتی تو مجھے انتظار رہتا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور دلربا لڑکیاں گاؤں میں اور میرے اردگرد موجود تھیں۔ شکل و صورت کے علاوہ ذہانت کے لحاظ سے بھی رابو کسی خاص زمرے میں نہیں آتی تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ بہت خوش گفتار ہو۔ ہاں تھوڑا سا پڑھی لکھی ضرور تھی۔ اس نے مڈل کیا تھا۔ گاؤں میں یہی بڑی بات تھی۔ بہرحال اس کی یہ تعلیمی قابلیت میرے لئے متاثر کن نہیں ہو سکتی تھی.........سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ دو وجوہات کے سبب میری نگاہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے ہر وقت میرے اردگرد رہتی ہے اور دوسری زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ وہ میرا بہت زیادہ دھیان رکھتی ہے۔ پچھلے سات آٹھ ماہ میں صرف ایک "تولیے والی" غلطی اس نے کی تھی۔ ورنہ میں شکایت کا موقع ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔ میں جب فارم سے حویلی پہنچتا' کمرے میں ہر شے زبردست قرینے سے رکھی ملتی۔ بستر بے شکن الماری کے پٹ بند' گھر پہننے والا لباس استری شدہ کھونٹی پر ٹنگا ہوا' غرض میرا کمرا ہی نہیں پوری حویلی میں قرینے کی ایک لہر سی دوڑی محسوس ہوتی تھی اور اس لہر کے پیچھے جو ہاتھ نظر آتا تھا وہ واضح طور پر رابو کا تھا۔ ماماں نے سچ ہی کہا تھا وہ

مشین کی طرح کام کرتی ہے۔

میں نے جو یہ کہا ہے کہ وہ میری نگاہ کا مرکز بنتی جا رہی تھی' تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں اس میدان میں اناڑی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ محبت کب کرنی چاہئے اور کب صرف دلچسپی لینی چاہئے۔ دلچسپی کے بے پناہ فوائد کے علاوہ' محبت کے لامحدود نقصانات بھی میرے علم میں تھے۔ میں رابو میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اور یہ وہی دلچسپی تھی جس کا تعلق مرد و زن کے جسمانی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ میرے کمرے کی صفائی رابو اس وقت کرتی تھی۔ جب میں فارم جا چکا ہوتا تھا' لیکن جمعے کے روز میں گھر پر ہوتا تھا اور اسے کمرے کی صفائی میری موجودگی میں کرنا ہوتی تھی۔ میں بستر پر نیم دراز ٹیلی ویژن دیکھتا یا اخبار کے مطالعے میں غرق رہتا۔ تاہم میری دزدیدہ نگاہیں رابو کو مصروف کار دیکھتی رہتیں۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا' گھومنا' جھکنا سب کچھ نگاہ کے راستے جسم میں اترتا اور سنسناہٹ پیدا کر دیتا۔ میں جانتا تھا رابو کے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ بھی نہیں جتنا میرے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ اور میرے ہونٹوں میں ہے۔ میں جب چاہوں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا ہوں لیکن درمیان میں "چھوٹے مالک" کی بلند و بالا دیوار کھڑی تھی۔ جو عزت و مان مجھے اس گاؤں نے دیا تھا وہ مجھ سے کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتا تھا اور ان میں ایک قربانی یہ بھی تھی کہ میں خود کو لب و رخسار کی رنگینیوں سے دور رکھوں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ جوانی میں ذہن کی سوچ خون کی حدت کے طابع ہوتی ہے۔ میں چھوٹے مالک کی مسند پر بیٹھ کر گاؤں کا کرتا دھرتا بن گیا تھا لیکن اندر سے وہی کھلنڈرا نوجوان تھا جو چند ماہ پہلے تک سہانی شاموں میں لاہور کی سڑکیں ناپتا تھا اور باغوں میں غیر نباتاتی حسن کی تلاش میں رہتا تھا.......... ایک دن ماماں چھٹی پر تھی۔ شام کے وقت رابو کو چائے لے کر آنا پڑا۔ وہ ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی اور میرے پلنگ کے قریب ٹھہر گئی۔ جب وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی' میری نگاہیں نہ چاہنے کے باوجود اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے کھلے گلے کی قمیض پہن رکھی تھی اور باریک اوڑھنی اس کا جسم چھپانے میں ناکام تھی۔ ایکا ایکی میرے اندر ایک بند سا ٹوٹ گیا اور شوریدہ سر لہریں جسم میں ہلچل مچانے لگیں۔ عوت ایسی ہلچل سے بہت جلد باخبر ہو جاتی ہے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا' رابو کے گندمی چہرے پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہونٹ ہمیشہ سے زیادہ متحرک دکھائی دیے۔ میں نے پوچھا۔

"تمہاری ماں اب کیسی ہے؟"

"پہلے سے اچھی ہے مالک۔"

"اس کا خیال رکھو' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"بہت اچھا مالک۔"

میں نے چائے کی چسکی لے کر کہا "اور چائے تم خود ہی لے کر آیا کرو۔ اچھی بناتی ہو۔"

"جی مالک۔"

وہ اوڑھنی درست کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں چائے سے زیادہ اس کے تصور کو پیتا رہا اور اپنی دھڑکنوں کا آہنگ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اگلے روز ماماں موجود تھی لیکن رابو خود ہی چائے لے کر آئی۔ ڈور کلوزر خود بخود دروازے کو بھیڑ چکا تھا۔ اس نے چائے بنا کر میرے ہاتھ میں تھمائی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"صبح غسل خانے میں صفائی تم کیا کرتی ہو یا ماماں؟"

"جی میں خود کرتی ہوں.........."

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ معلوم ہے مجھے کیسے پتا چلا؟"

"جی کیسے؟"

"ایسے کہ برش اسٹینڈ کے اوپر جو تھوڑی سی جگہ ہے اس پر مٹی جمی ہے۔ شاید پچھلے تین ماہ سے اسے صاف نہیں کیا گیا' لیکن اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا قد سوا پانچ فٹ ہے اور سوا پانچ فٹ سے وہ مٹی نظر نہیں آتی۔ میں چھ فٹ کا ہوں اس لئے نظر آجاتی ہے۔ ماماں بھی خاصی لمبی تڑنگی ہے اس لئے وہ بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ غسل خانہ صرف تم ہی صاف کرتی ہو۔"

میری تشریح پر رابو پریشان ہو گئی۔ آہستگی سے بولی "معاف کیجئے چھوٹے مالک! میں ابھی صاف کئے دیتی ہوں۔"

وہ غسل خانے میں چلی گئی تو میں بھی چائے چھوڑ کر اس کے پیچھے گیا۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی برش اسٹینڈ کے عقبی خلا میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو کو دو انگلیوں پر لپیٹ کر مٹی صاف کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سمجھایا "ایسے نہیں بھئی! یہ دیکھو یہ جھاڑن ہے ناں۔ اسے اس طرح اچھال کر اسٹینڈ کے پیچھے ڈال دو۔ پھر دونوں کونے پکڑ کر دائیں بائیں حرکت دو۔ یہ آسان طریقہ ہے۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ یہ سب کچھ سمجھانے بجھانے کے چکر میں' میں اس کے کافی قریب آچکا تھا۔ میرا ایک پہلو اس کے جسمانی نشیب و فراز سے آگاہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ بڑی دلچسپ صورت حال ہوتی ہے جب سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھا جائے۔ چند ہی لمحے میں یہ کھیل ختم ہوا اور وہ وحشی ہرنی کے مانند کمرے سے نکل بھاگی۔ میرے لئے یہی حوصلہ افزائی بہت تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ٹرالی لینے آئی تو میں نے نگاہیں پوری بے باکی سے اس کی نگاہوں میں گاڑ دیں۔ وہ سٹپٹا کر نیچے دیکھنے لگی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی اپنے کمرے میں' کبھی حویلی کی چھت پر' کبھی باغ کے کسی گوشے میں۔ یہ ساری چار دیواری میری شکار گاہ تھی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کے وقت' اپنی من پسند جگہ پر گھات لگاتا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گاؤں آکر کئی پابندیاں میں نے اپنے اوپر خواہ مخواہ لگا لی ہیں۔ شہروں کو رومان پروری میں فوقیت ضرور حاصل ہے لیکن دیہات میں بھی دیہی ڈھنگ سے خاصی "پیش رفت" ہو چکی ہے۔

ایک روز مجھے تاریخ پر لاہور جانا تھا۔ تین چار دن کا کام تھا۔ میں لباس بدل چکا تھا۔ بریف کیس بھی تیار تھا۔ باہر منشی خادم حسین اور ڈرائیور یار محمد کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ دل چاہا کہ جانے سے پہلے رابو سے دو باتیں کروں۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ کوئی ایسا کام دکھائی نہیں دیا جس کے بہانے اسے بلایا جاتا۔ پھر سوچا کہ ایسی بھی کیا بات ہے۔ میں بغیر بہانے کے اسے بلا سکتا ہوں۔ آخر میں "چھوٹے مالک" ہوں۔ ماماں کو آواز دی کہ وہ رابو کو بھیجے۔ تھوڑی دیر بعد رابو آگئی۔ وہ شاید آٹا گوندھتی آئی تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک دھلے ہوئے تھے۔

"جی 'کیا بات ہے؟" اس نے حسب معمول دھیمی آواز میں پوچھا۔ خشک بالوں کی ایک لٹ اس کے پھیکے پھیکے سے رخسار پر جھول رہی تھی۔

پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ لیا تھا لیکن چہرے مہرے سے ظاہر تھا کہ جواب وہ جانتی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ جونہی ڈور کلوزر نے دروازے کو بھیڑا میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ میرا ہدف اس کے لب تھے۔ پتا نہیں وہ کس کے لب تھے جو اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ میں کافی دیر یہ "معما" حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک اس کے کومل جسم نے جھٹکا کھایا "کوئی آرہا ہے۔" وہ

جلدی سے الگ ہو گئی۔ ایسے معاملات میں عورت کی حسیات ہمیشہ قابل بھروسا رہی ہیں۔ واقعی کوئی آرہا تھا۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ پٹ وا ہوئے تو سامنے ماماں کھڑی تھی۔ اس نے اطلاع دی کہ رابو کی ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اس اعلان پر بھونچکا رہ گیا۔ خیال آیا کہ شاید رابو والی بات اس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے اور اس نے مجھے بازپرس کے لئے بلایا ہے۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال پر لعنت بھیجی۔ یہ لاہور نہیں میرا گاؤں تھا۔ یہاں زمین کی ہر انچ میری ملکیت تھی۔ اور لوگوں کا رزق میرے وسیلے سے ان تک پہنچتا تھا۔ مجھ سے کون بازپرس کر سکتا تھا۔ میں نے جھنجلا کر ماماں سے پوچھا "کون ملنا چاہتا ہے؟"

"رابو کی ماں، چھوٹے مالک" ماماں نے دہرایا۔ "اس کی منجھی حویلی کے دروازے پر رکھی ہے۔"

رابو پہلے ہی ہراساں تھی، منجھی یعنی چارپائی کا ذکر سن کر اور ڈر گئی۔ بغیر پوچھے باہر کی طرف بھاگی۔ میں کچھ دیر کشمکش و پیچ میں کھڑا رہا۔ میری الجھن دیکھ کر ماماں نے کہا۔ "چھوٹے مالک، اس کی حالت بڑی کھراب ہے۔ بس ایک دو گھڑی کی مہمان ہے۔ شاید آپ سے اجاجت لینا چاہتی ہے۔"

"اجازت.......... کیسی اجازت؟"

"مرنے کی اجاجت مالک اور کس کی۔ وہ کہتی ہے مالک اجاجت دے گا تو میری جان آسانی سے نکل جائے گی۔ ہمارے کھاندان میں یہی قاعدہ ہے کہ مالک اجاجت دے تو مسکل آسان ہو جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری بڑی بہن کی جان نہیں نکلتی تھی تو اس نے بھی اللہ بکھسے "بڑے مالک" سے اجاجت لی تھی۔"

"یہ کیا بیہودگی ہے" میں بے ساختہ بڑبڑایا۔ پہلے تو دل میں آئی کہ ماماں سے کہہ دوں کہ میں نہیں جا سکتا۔ مگر پھر سوچا کہ گاؤں والے کیا کہیں گے۔ بڑھیا کے پیچھے چلتا حویلی سے باہر نکلا۔ دروازے پر ایک چارپائی رکھی تھی جس پر ہڈیوں کا ایک ناقابل شناخت ڈھانچا پڑا تھا۔ یہی رابو کی ماں تھی۔ چارپائی کے گرد حویلی کے ملازمین اور دوسرے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رابو ماں کے سرہانے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رابو کی ماں کی آنکھوں میں عجیب چمک نمودار ہوئی مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی اپنے ڈھانچے کو سمیٹ کر اٹھے گی اور میرے پاؤں میں گر پڑے گی۔ اس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں بے اختیار چند انچ پیچھے سرک گیا۔ یہ سراسر اضطراری فعل تھا۔ ورنہ اس جاں بلب

عورت میں اتنی سکت کہاں تھی کہ ایسی حرکت کر سکتی۔ اس نے اپنا استخوانی ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا پھر اس کے لب حرکت کرنے لگے۔ لوگ بالکل خاموش کھڑے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے کسی ردعمل کی توقع کر رہے ہیں۔ ذہن نے مشورہ دیا کہ مجھے عورت کے قریب ہو کر اس کی بات سننی چاہئے۔ ناگواری کو دباتے ہوئے عورت کے چہرے کی طرف جھک گیا۔ اس کے خدوخال اب کچھ کچھ میری پہچان میں آنے لگے تھے۔ اس کا نام شاید طالعہ تھا۔ ہم سب اسے تالیاں تالیاں کہا کرتے تھے۔ تالیاں وہی کام کرتی تھی جو اب اس کی بیٹی انجام دیتی تھی۔ میں بچپن میں اسے اکثر حویلی کی چار دیواری میں گھومتے دیکھتا تھا۔ کبھی برتن مانجھتے، کبھی فرش دھوتے کبھی ڈھیروں کپڑے استری کرتے۔ پھر میں لاہور چلا گیا۔ بس کبھی کبھار آنا ہوتا تھا۔ چند سال پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تالیاں بیمار ہے اور کام پر نہیں آتی۔ اتنے برس بعد آج اس کی بیماری انجام کو پہنچ رہی تھی۔ وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

"چھوٹے مالک.......... مجھے اجاجت دو۔ اگر کوئی گلتی ہو گئی ہے تو ماف کر دینا۔"

میں نے کہا "حوصلہ رکھو تالیاں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" کتنے بے روح، بے محل الفاظ تھے یہ اس کے باوجود میں یہی الفاظ کہہ سکتا تھا۔

تالیاں نے کہا "مالک، میرا سفر کھتم ہو رہا ہے۔ بس ایک بنتی کرنی ہے آپ سے۔"

"ہاں ہاں، کہو" میں نے چور نظروں سے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"رابو اب آپ کے سپرد ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ ابھی بالڑی ہے، کوئی گلتی کرے تو اسے معاف کر دینا۔"

میں نے دیکھا تالیاں کی گدلی آنکھوں میں عاجزی کے سوا اور کچھ نہیں ... بے زبان خاموشی وہ مجھ سے کہہ رہی تھی "مالک! اپنی عمر بھر کی خدمت کے عوض میر ... سے صرف اپنی بیٹی کی سرپرستی مانگتی ہوں۔ تین کپڑوں میں اسے عزت کے ساتھ ... نے لگا دینا۔"

"بے فکر رہو تالیاں" میں نے اپنی بھاری آواز کو کچھ اور بھاری ب... ا کر کہا "رابو اور ماماں ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ میں انہیں اپنی ذمے ... ا سمجھتا ہوں۔"

میں جلد از جلد تالیاں کے پاس سے اٹھنا چاہتا تھا۔ میری مرضی میہ ... شناس نفسی

خوب سمجھتا تھا۔ وہ میرے قریب جھک کر بولا "چھوٹے مالک' جلدی کیجئے۔ وکیل صاحب کا وقت نکل جائے گا۔"

میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ روتی دھوتی رابو پر ڈالی اور اپنے ملازمین کے ساتھ کار میں جا بیٹھا۔

لاہور میں میرا کام تین روز میں ختم ہو گیا' لیکن پھر تین چار روز افروزہ کی ناز برداریوں میں لگ گئے۔ افروزہ کا تعلق ہماری برادری سے تھا۔ نہایت خوش حال صنعت کار باپ کی بیٹی تھی۔ درحقیقت عملی زندگی میں' میں افروزہ کے والد انوار صاحب سے بے حد متاثر تھا۔ میری طرح انہیں بھی نوجوانی میں "صنعت کار" بننے کا جنون تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب رہے تھے جب کہ میں اپنے راستے پر آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے چلا آیا تھا۔ افروزہ حسین ہونے کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھی۔ میری اور اس کی ملازمت کالج کے زمانے میں ہوئی تھی۔ خاندانی قربت کے سبب ہمارے تعلقات تیزی سے بڑھے اور ہم ایک دوسرے کو کافی حد تک سمجھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری طرف سے شادی کی پیش کش ہوئی تو دوسری جانب سے انکار نہیں ہو گا۔ مگر یہ فیصلہ میں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے زندگی میں ہر کام سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ شادی میں عجلت کیسے کر لیتا۔ ایک ہفتے بعد جب میں لاہور سے فارغ ہو کر خوشاب پہنچا تو رابو کی ماں کو لحد میں اترے چار دن ہو چکے تھے۔

○-----------☆-----------○

وقت اپنی مخصوص رفتار گزرتا رہا۔ میں پوری تندہی سے اپنے پولٹری فارم کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب میں دیہی ماحول سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ ہر اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا اور آغاز میں جو جھجک سی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔ جن دنوں میں حویلی میں ہوتا اکثر رابو سے ملاقات ہوتی رہتی۔ میں موقع دیکھ کر اسے بلاتا۔ میرے ایک اشارے پر وہ کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی۔ میں اسے بانہوں میں سمیٹ کر اس بات کے واشگاف ثبوت فراہم کرتا کہ وہ میری ضرورت ہے لیکن ایک بات ہے۔ رابو کی تمام تر خود سپردگیوں کے باوجود میں نے ہمیشہ خود کو اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کی وجہ میں خود بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ بس ایک دیوار سی میرے سامنے آجاتی تھی۔ میں محسوس کرتا اس دیوار پر بڑے بڑے جلی حروف میں "چھوٹے مالک" لکھا ہے' اور وہ ان گنت جملے درج ہیں جو لوگ میری عزت افزائی

میں کہتے سنتے ہیں۔ اس دیوار کے اوپر مجھے اپنے باپ دادا اور ان کے بزرگوں کی شاندار پگڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں۔ مجھے لگتا' یہ دیوار گری تو یہ سب پگڑیاں بھی مٹی میں رل جائیں گی.......... اور یہ دیوار صرف رابو اور میرے درمیان ہی نہیں تھی' میں جب بھی کوئی ایسا کام کرتا جس پر میرے اندر کے انسان کو قلق ہوتا' یہ دیوار ابھر کر سامنے آجاتی۔ اگر اسے خود ستائشی نہ سمجھا جائے تو کہوں گا کہ اپنی تمام تر رنگین طبعی کے باوجود خون میں شرافت اور پارسائی کا وہ جوہر کسی نہ کسی درجے میں موجود تھا جو مجھے وراثت میں ملا تھا اور جس کے سبب لوگ میرے بزرگوں کی عزت کرتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے' صبح میں خلاف معمول دھوپ.......... سینکنے کے لئے چھت پر چلا گیا۔ نو دس بجے کا وقت ہو چکا تھا لیکن آج فارم پر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دراصل کچھ شہری دوستوں کے ساتھ میں مرغابی کے شکار پر گیا ہوا تھا اور اس سہ روزہ مہم سے کل رات ہی واپسی ہوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ آج سارا دن آرام کیا جائے۔ دفعتاً نیچے صحن کی طرف سے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔ غالباً رابو کسی دوسری نوکرانی سے جھگڑ رہی تھی۔ میں نے منڈیر کے جھروکے سے جھانک کر دیکھا۔ نلکے کے نیچے رابو اور چھپا کھڑی تھیں۔ چھپا میرے وہ شکاری بوٹ دھو رہی تھی جو کیچڑ اور گھاس پھونس کے ملغوبے سے لتھڑے ہوئے تھے۔ بوٹوں سے آلائش جدا کرنے کے لئے چھپا نے جھاڑو استعمال کیا تھا۔ رابو اسی بات پر خفا ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چھپا نے بوٹوں کو جھاڑو سے کھرچ کر "ناقابل معافی جرم" کیا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چھپا کو دھکیل کر پرے ہٹا دیا اور خود بوٹ دھونے بیٹھ گئی۔ میں جھروکے پر رکوع کے بل جھکا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چھپا چلی گئی تو رابو نے بڑی تسلی سے بوٹ دھونے شروع کئے۔ وہ کیچڑ اور گوبر وغیرہ اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔ بڑی محبت اور ملائمت کے ساتھ۔ جیسے بوٹ نہ ہوں کسی پیارے کا چہرہ ہو۔ بوٹ دھل گئے تو اس نے انہیں اپنی اوڑھنی سے پونچھا اور دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھ دیا.......... پھر کہنیوں تک ہاتھ دھونے کے بعد بکھرے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت میں باندھا اور دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ آستین چڑھائے صحن میں ادھر ادھر گھومتی وہ مجھے اچھی لگی۔ کبھی کبھی وہ خاصی پرکشش لگتی تھی۔ کوشش کے باوجود میں جان نہیں سکا کہ یہ کشش کہاں ہے۔ اس کے ہونٹوں میں' اس کے متوازن جسم میں' اس کی بھرپور نسوانی مسکراہٹ میں یا ان عریاں بانہوں میں جو اس کی چڑھی آستینوں میں سے جھانکتی رہتی تھیں.......... اس کے چہرے پر جگہ جگہ

خوبصورتی کے نخلستان تھے۔ جن کی ٹھنڈک پیاسے ہونٹوں کو سیراب کر سکتی تھی۔ میں محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ میں کوئی مجبور عاشق نہیں تھا کہ آہیں بھر کر رہ جاتا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی تو میں اس کیفیت کا اظہار عملاً کر سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ رات شہری دوستوں نے میرے کمرے میں جو ہڑبونگ مچائی تھی اس کے اثرات جوں کے توں ہوں گے اور رابو کو کمرا سنبھالنے میں کافی وقت لگے گا۔ اس "کافی وقت" میں سے کچھ وقت میں اپنے استعمال میں بھی لا سکتا تھا۔ چھت سے اتر کر میں بیڈ روم میں پہنچ گیا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کمرا آئینے کی طرح صاف تھا۔ ہر شے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ مجال ہے جو کہیں کوئی بے ترتیبی نظر آئے۔ یہ سب رابو ہی کا کیا دھرا تھا۔ وہ کام اچھا ہی نہیں زیادہ بھی کرتی تھی۔ یعنی کوالٹی اور کوانٹیٹی دونوں میں لاجواب۔ صبح سات بجے کے قریب حویلی میں داخل ہوتی تھی اور رات دس بجے تک بے تکان جتی رہتی تھی۔ دوسرے ملازمین یقیناً رابو پر دانت پیستے ہوں گے۔ کیوں کہ رابو کی وجہ سے انہیں بھی چستی کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ رابو اب میرا سامنا کرنے سے کتراتی ہے۔ کمرے کی آناً فاناً صفائی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ یقیناً حویلی کے ملازمین کو ہمارے تعلق کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اور ان کی آگاہی رابو کے لئے حجاب بنتی جا رہی تھی۔ کچھ بھی تھا' ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اتنی اچھی لگی تھی کہ اس کا کمرے میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کرنے کے بعد قمیض کے گریبان سے ایک بٹن توڑ کر علیحدہ کر دیا اور گرج کر ماماں کو آواز دی۔ وہ حسب معمول بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے کہا۔

"یہ قمیض کا بٹن کہاں ہے؟"

وہ ٹوٹا ہوا بٹن دیکھ کر اور گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی "غلطی ہو گئی چھوٹے مالک! میں ابھی ٹانک دیتی ہوں۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سوئی دھاگا ڈھونڈ کر وہ میری طرف بڑھی۔ پھر اس کے ذہن میں وہ بات آئی جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ بٹن ٹانکنا ماماں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اسے تو معلوم نہیں سوئی کیسے نظر آ گئی تھی۔ ہراساں لہجے میں بولی۔ "ایک منٹ چھوٹے مالک' میں رابو کو بھیجتی ہوں۔"

سلیپر کھٹ کھٹ بجاتی ہوئی وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں زیر لب مسکرانے لگا۔ چند لمحے بعد رابو سوئی دھاگا لئے اندر آئی۔ کھلا گریبان اور اس میں سے جھانکتے

ہوئے سیاہ بال دیکھ کر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے بولی۔ "دیجئے قمیض۔"

"نہیں' ایسے ہی لگا دو" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس کی شوخ سیاہ آنکھیں ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں سے ٹکرائیں پھر وہ آگے بڑھ کر ٹوٹے ہوئے دھاگے گریبان سے چننے لگی "بٹن کہاں ہے؟"

"کون سا؟"

"جو آپ نے توڑا ہے۔"

میں نے مسکرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹن اس کے حوالے کر دیا۔ وہ بٹن ٹانکنے لگی' انگلیوں کی پوریں میرے سینے کے بالوں سے الجھ رہی تھیں۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی بو کئی طرح کی ہوتی تھی۔ صابن کی بو' ترکاری کی بو' مشقت کے پسینے کی بو' لیکن ان ساری بوؤں کو وہ ایک تیز خوشبو میں چھپا لیتی تھی۔ یہ کوئی مصنوعی خوشبو نہیں تھی۔ اس کے کنوارے جسم کی مہک تھی جو ایک مست ادا کے ساتھ مجھے گھیر لیتی تھی۔ وہ بٹن لگا چکی تو میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ رابو.......... میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی کھوجی نگاہوں نے ایک لمحے میں میرے چنچل منصوبوں کی ٹوہ لے لی۔ بولی "ابھی نہیں چھوٹے مالک! ماماں اور چمپا باہر گھوم رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں بازار چلی جائیں گی تو آؤں گی۔"

میں نے اسے جانے دیا.......... گھڑے کی مچھلی ہی تو تھی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر کے حالات درست کر کے واپس آ گئی۔ میں نے بانہیں کھولیں تو وہ ان میں یوں سما گئی جیسے ان بانہوں کا ہی ایک حصہ ہو۔ میں نے اس کے الجھے سلجھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "رابو! کیوں میرے لئے اپنی جان ہلکان کرتی ہو۔ میں کوئی ایسا اچھا آدمی تو نہیں ہوں" وہ اس سوال پر خاموش رہی۔ میں نے اسے تھوڑا سا جھنجھوڑ کر جواب دینے پر اصرار کیا۔

وہ میرے کندھے کے گداز میں اپنی ناک دھنسا کر بولی۔ "چھوٹے مالک' میں تو کچھ بھی نہیں کرتی۔ میرے بس میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر آپ کے پاؤں میں ڈالوں۔"

میں نے کھینچ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا "لیکن کیوں؟"

اس نے بڑا سادہ سا جواب دیا لیکن اس جواب نے مجھے لرزا دیا۔ وہ بولی "آپ

ہی تو میرے سب کچھ ہیں" یہ بات کہتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا' آنکھیں بند تھیں اور خوب صورت لب ادھ کھلے تھے' جیسے وہ مجھ سے نہیں' آسمان سے مخاطب ہے۔ اس نیلگوں بلندی سے مخاطب ہے جو قوت' اختیار اور لازوال عظمتوں کی علامت ہے۔ اس کے انداز نے مجھے شرمسار کر ڈالا۔ شرمساری کو چھپانے کے لئے میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا۔

وقت کا پنچھی روز و شب کے پر لگائے اڑتا رہا۔ حویلی کی چار دیواری میں رابو وقتاً فوقتاً میری تنہائی کو چمکاتی رہی۔ ایک موقع پر تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں سچ مچ رابو کی محبت میں گرفتار ہو رہا ہوں۔ یہ عجیب ہی کیفیت تھی۔ کبھی ہر وقت ہوتی اور کبھی دنوں تک نہ ہوتی۔ کہتے ہیں خواب ان سوچوں کا سایہ ہوتے ہیں جو ہم جاگتے ذہن سے سوچتے ہیں۔ میرے خوابوں میں رابو کا گزر ہونے لگا اور کبھی کبھی میں اسے ایک دلہن کے روپ میں دیکھتا۔ سرخ جوڑے میں لپٹی وہ میرے سامنے آتی۔ میں کھڑا اس کی طرف تکتا رہتا۔ کبھی خیال آتا' یہ میری دلہن ہے اور میرے قدموں کی چاپ کا انتظار کر رہی ہے۔ کبھی سوچتا کہ یہ معمولی لڑکی میری دلہن کیسے ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہ کسی اور کی امانت ہے اور میں اسے ایک غیر محرم کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا لیکن آنکھوں کو جتنا موندنے کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی کھلتی جاتیں اور میں بیدار ہو جاتا۔

بہت جلد میں نے اپنی سوچوں کا دھارا بدل کر اس خواب پر قابو پا لیا۔ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رابو سے کسی طرح بھی میرا جوڑ نہیں۔ اس میں کوئی ایک بات بھی نہیں جس کی خاطر پوری زندگی اس سے وابستہ کی جائے۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی مگر اسے شریک حیات بنانا میرے جیسے شخص کے لئے جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ذہن میں یہ خیال مستحکم ہونے کے بعد مجھے اپنا وہ فرض یاد آنے لگا جو رابو کی ماں نے مرتے وقت مجھ پر عائد کیا تھا۔ میں رابو کی شادی کا سوچنے لگا۔ رابو کے قریبی عزیزوں میں صرف ایک ماماں تھی جس سے مشورہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ماماں سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ ہری پور میں ان کے کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کا "دارا" نامی لڑکا کئی بار گاؤں بھی آ چکا ہے۔ وہ برسر روزگار ہے۔ فروٹ کی ٹوکریاں اور چھابے وغیرہ بنانے کا کام کرتا ہے۔ رابو کی مرحومہ ماں چاہتی تھی کہ رابو کا بیاہ دارا سے ہو جائے۔

میں نے ماماں سے کہا کہ وہ ہری پور جا کر ان لوگوں کی مرضی معلوم کرے اور اگر بات بنتی ہے تو رابو کا رشتہ طے کر دے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا' میں بھی کروں گا۔ ماماں اس بات پر خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ اگلے ہی روز وہ اپنی گٹھری باندھ کر ہری پور روانہ ہو گئی.......... رابو غالباً ان معاملات سے لاعلم تھی۔ ماماں کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی۔ وہ کامیاب لوٹی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہری پور میں اس کی ملاقات اپنے ایک بھائی سے بھی ہو گئی ہے اور ان دونوں نے مل کر رابو کا معاملہ طے کر دیا ہے۔

ہماری حویلی میں رب نواز کے اہل خانہ کی حیثیت عام ملازموں سے مختلف تھی۔ عام ملازم کی بیٹی کو شادی پر پانچ ہزار روپے نقد یا اس کے برابر جنس ملتی تھی۔ میں نے رابو کے لئے دس ہزار روپے وقف کئے۔ آٹھ ہزار روپیہ میں نے اپنے منشی کو ماماں کی موجودگی میں دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اسے بہتر طریقے سے استعمال کریں۔

ایک روز جب میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور رابو میرے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی' میں نے آہستگی سے پوچھا "رابو' تو اس شادی سے خوش ہے نا؟"

اس کی انگلیوں میں اجنبی سی لرزش پیدا ہوئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ میں نے مڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ خوشی نہ غم' نہ دکھ نہ شکر گزاری' تراشیدہ ہونٹ باہم پیوست تھے۔ میں نے کہا "تم نے جواب نہیں دیا' دارا کیسا لڑکا ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے اسے دیکھا ہوا ہے نا؟"

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اس کے ساتھ خوش رہو گی ناں؟"

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ بالوں میں انگلیوں کی حرکت بے ترتیب ہو گئی۔ اس نے سر اس انداز سے جھکایا کہ اوڑھنی خود بخود گھونگھٹ بن گئی۔ اس میلے سے بوسیدہ گھونگٹ نے سب کچھ چھپا لیا.......... یہ کوئی معمولی گھونگٹ نہیں تھا۔ اس چند بالشت کپڑے کی اوٹ میں مشرقی عورت ہزاروں طوفان چھپا لیتی ہے۔ چیختی چنگھاڑتی آندھیاں' اشکوں کے سمندر' خوشیوں کے انبار اور دکھوں کے پہاڑ سب کچھ اس گھونگٹ کے پیچھے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ گھونگٹ ہزار سال پہلے بھی ناقابل عبور تھا اور آج بھی ہے۔ کوئی ایکسرے مشین کوئی لیزر کوئی اینٹی ڈارک اور اینٹی کلاتھ شیشہ اس گھونگٹ کے پیچھے نہیں جھانک سکتا۔

چند دنوں بعد رابو حویلی میں کم کم نظر آنے لگی۔ میں نے ماماں سے پوچھا۔ اس

نے بتایا کہ شادی قریب آ گئی ہے۔ اس لئے وہ سینے پرونے میں مصروف رہتی ہے۔ مجھے اس بات پر دھچکا سا لگا لیکن کئی دوسرے دھچکوں کی طرح میں اسے بھی بہ آسانی برداشت کر گیا۔ میں زیادہ وقت فارم میں گزارنے لگا۔ مرغیوں کے علاوہ اب میں بٹیر کی افزائش کا کام بھی شروع کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے میں انڈے سینے کی مشین "انکوبیٹرز" مقامی کاریگروں سے بنوا رہا تھا۔ اس سلسلے میں افروزہ کے والد بھی میری مدد کر رہے تھے۔

رات گئے میں فارم سے آتا اور پڑ کر سو رہتا۔ حویلی کے حالات کی زیادہ خبر نہیں رہتی تھی۔ ایک روز ماماں نے بتایا کہ پرسوں جمعے کے روز رابو مایوں بیٹھے گی (اس رسم کے بعد لڑکی شادی سے پہلے کہیں آجا نہیں سکتی) شادی میں اب چھ سات روز ہی رہ گئے تھے۔ ماماں کی درخواست پر میں نے اسے اخراجات کے سلسلے میں دو ہزار روپے مزید دے دیئے۔

جمعے کے روز میں حویلی میں ہی ستا رہا تھا۔ اچانک رابو نظر آئی۔ حسب معمول اڑسی ہوئی آستینوں میں سے اس کی سڈول بانہیں جھلک رہی تھیں اور وہ کام پر آمادہ نظر آتی تھی۔ میں نے حیرانی سے کہا "رابو! آج تو تیری رسم ادا ہونی تھی۔ تو یہاں چلی آئی؟"

وہ بولی "رسم کا کیا ہے، شام کو ہو جائے گی" پھر وہ تیزی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانہ صاف کرنے کے بعد باہر نکلی اور کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔ اس روز میں اس کی تندہی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے لگا جیسے کوئی ستارہ ڈوبنے سے پہلے آخری بار اپنی چمک دکھا رہا ہے۔ اس نے میرے سارے ان دھلے کپڑوں کا انبار صحن میں لگا لیا اور دھونے بیٹھ گئی۔ ان کپڑوں میں میرے کمرے کے دبیز پردے اور مسہریوں کی چادریں وغیرہ شامل تھیں۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو حویلی کا فرش دھونے لگی۔ بعد ازاں کچن میں چلی گئی اور کھانا پکانے میں باورچن کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اتنی دیر میں کپڑے سوکھ گئے۔ اس نے انہیں استری کر کے الماریوں میں رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میرے مختلف جوتے پالش کئے، میری کتابوں کو سلیقے سے لگایا اور روز مرہ استعمال کی اشیاء کو مقررہ جگہوں پر رکھا۔ اس دوران اس نے مجھے دو بار چائے بھی بنا کر دی۔ میرے اندازے کے مطابق سات آٹھ گھنٹوں میں اس نے جتنا کام کیا وہ کوئی دوسری ملازمہ آٹھ دن میں بھی نہ کر پاتی۔ شام کو وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا اس کے گندمی رخساروں پر نقاہت کی زردی تھی لیکن آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تازہ دم ہے۔ ماماں میرے پاس آئی، کہنے لگی۔

"چھوٹے مالک، آپ ہی اسے کچھ کہیں۔ دوپہر سے گھر میں عورتیں آئی بیٹھی ہیں اور یہ گھر جانے کا نام نہیں لے رہی۔"

میں نے رابو کو پاس بلایا "جی" وہ سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"بھئی، تم گھر کیوں نہیں جاتی ہو۔ ماماں پریشان ہو رہی ہے۔ جاؤ اب گھر، بہت کام ہو چکا۔"

"بس چھوٹے مالک، ابھی جا رہی ہوں۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"

"کیا رہ گیا ہے اب؟"

"وہ.......... وہ کھانا لگا دوں آپ کے لئے۔"

"نہیں، لگ جائے گا کھانا" میں نے قدرے جھنجلا کر کہا "بہت ہیں یہاں کھانا لگانے والے۔ جاؤ اب تم۔ وہاں دوپہر سے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔"

میرے لہجے نے اسے ایک دم دکھی کر دیا۔ کوئی لو سی بھڑک کر اس کے رخساروں میں بجھ گئی "جی اچھا" وہ آہستگی سے بولی اور میری طرف دیکھے بغیر ماماں کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ آخری وقت مجھے ایسے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کچھ دیر میں اس افسوس میں بیٹھا رہا، پھر کسی دوسرے دھیان میں لگ کر سب کچھ بھول گیا۔

O-----------☆-----------O

ٹھیک سات روز بعد رابو کی شادی ہو گئی۔ میں شام کے وقت فارم سے واپس آیا تو حویلی کے دروازے کے سامنے دلہا دلہن اور براتی کھڑے تھے۔ برات کی سواریاں یعنی ایک پیلی چھت والی ٹیکسی اور دو ٹریکٹر ٹرالیاں بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ منشی خادم حسین نے بتایا کہ یہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں؟"

منشی نے کہا "رواج کے مطابق یہ لوگ آپ کو سلام کئے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ میں نے اس موقع سے فرار حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن پنجابی کہاوت کے مطابق "موسیٰ ڈریا موت کولوں تے موت اگے کھڑی" آخر سامنا کرنا ہی پڑا تھا۔ جوں ہی میں اپنی ہنڈا کار سے اترا، ماماں نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں میں دوپٹا بچھا دیا۔ غالباً یہ بھی کوئی رسم تھی۔ دلہا دلہن آگے آئے اور ہندوؤں کے انداز میں پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں اس عمل سے روکا۔ وہ دونوں

سر جھکائے کھڑے رہے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں مضحکہ خیز صورت حال کا شکار ہوں۔ اپنی عمر سے قطع نظر میں حویلی کا مالک اور گاؤں کا معتبر اعلیٰ تھا۔ مجھ سے توقع کی جا رہی تھی کہ میں دلہا دلہن کے سر پر دست شفقت رکھوں۔ میں نے اس "کٹھن" ذمے داری سے کنی کتراتے ہوئے جیب سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکالے اور نوبیاہتا جوڑے کو دے دیئے۔ دلہا جو درمیانے قد کا گہرا سانولا شخص تھا اس نوازش پر فرط احترام سے دہرا ہونے لگا۔ رابو نے سر جھکا کر خاموشی سے شکریہ ادا کیا اور دلہا کے ساتھ الٹے پاؤں چل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ جب تک میں رخ پھیر کر حویلی میں داخل نہیں ہو گیا وہ لوگ وہیں کھڑے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اپنے کمرے کی ایک کھڑکی سے ٹریکٹر ٹرالیوں اور ٹیکسی کو راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ رابو جا چکی تھی۔

جانے کے بعد لوگ عموماً یاد آتے ہیں۔ رابو بیاہ کر پیا کے دیس چلی گئی تو دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنا بہت کچھ گنوا دیا ہے۔ اول اول میں سمجھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے۔ جلد ہی میں کار دنیا میں محو ہو جاؤں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وقت کی دھند میں رابو کا چہرہ دھندلانے کے بجائے اور نکھرتا چلا گیا۔ رابو کی شادی کے دنوں میں میرے اندر جو ایک دراڑ سی پیدا ہوئی تھی وہ اب پھیل کر ایک وسیع و عریض خلا میں بدل چکی تھی اور یہ خلا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے بہت کچھ اس خلا میں جھونکنے کی کوشش کی۔ شکار کھیلا' سیرو تفریح کی' کئی ہفتے لاہور رہ کر افروزہ کے پہلو سے لگا رہا لیکن سب بے سود رہا۔ جونہی میں حویلی میں واپس آتا در و دیوار پر رابو کی شبیہہ چھپاں نظر آتی۔ میں اس کے قدموں کی چاپ سنتا اس کی مدھم آواز راہداریوں میں گونجتی اور دو بھیدوں بھری سیاہ آنکھیں میرے ارد گرد لہکرانے لگتیں۔ میں جھنجلا کر بال مٹھیوں میں جکڑ لیتا اور بڑبڑانے لگتا "کون سی حور پری تھی وہ۔ کیا رکھا تھا اس میں' کیوں یاد کرتا ہوں میں اسے' لعنت ہے مجھ پر اور میرے ذوق پر "ایسے میں' میں افروزہ کا خوشبودار جسم اپنے تصور میں بسانے کی کوشش کرتا۔ اس کی بے پناہ نفاست' ذہانت اور خوب صورتی کو ذہن میں لاتا اور سوچتا رابو کا اس سے کیا مقابلہ ہے۔ واقعی رابو کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ دونوں بالکل مختلف عورتیں تھیں۔ پھر بھی میں رابو کو یاد کر رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری دلی کیفیت ابتر ہوتی گئی۔ ایک روز رابو کے رخساروں جیسی زرد گندم کے کھیتوں میں اداس پھرتے پھرتے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں.......... رابو کے عشق میں.......... میں سرتاپا لرز گیا۔ کس

قدر شرم کی بات تھی اور کتنی توہین آمیز۔ میں جو معمولی نسل کا جانور نہیں خریدتا تھا۔ کم ذات شخص سے بات نہیں کرتا تھا' ایک قطعی معمولی لڑکی سے عشق کر رہا تھا۔ حماقت سی حماقت تھی' بلکہ حماقتوں کا سلسلہ تھا۔ بہتر تو یہی تھا کہ رابو جیسی لڑکی کو نگاہ میں جگہ ہی نہ دی جاتی اور اگر جگہ دے دی تھی تو پھر اس سے اتنا قریب نہ ہوا جاتا۔ میں نہ صرف قریب ہوا تھا بلکہ حتمی قربت کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ کوئی دیکھنے یا ٹوکنے والا نہیں تھا۔ وہ انگارہ جو آج شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا۔ میرے کمرے میں یا حویلی کے کسی گوشے میں باآسانی بجھایا جا سکتا تھا۔ اس پر اتنا پانی پھینکا جا سکتا تھا کہ وہ غتربود ہو جاتا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو رابو سے شادی کی جا سکتی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی کسی کو اعتراض کا کیا حق تھا' بدصورت تو نہیں تھی۔ پڑھی لکھی بھی تھی' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اندر ایک پجارن بیٹھی تھی جو اپنے اشکوں سے میرے پاؤں دھو دھو پینا چاہتی تھی۔ اب آخری حماقت میں یہ کر رہا تھا کہ اس وقت جب سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں اپنی آہوں سے محبت کے بھڑکتے شعلے کو دن رات ہوا دے رہا تھا۔

شادی کے بعد تین چار ماہ تک رابو مجھے بالکل نظر نہیں آئی۔ پھر ایک روز وہ یوں نمودار ہوئی جیسے اچانک بادل پھٹ جائیں اور سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگے۔ میں گاؤں سے باہر اپنے فارم پر بیٹھا تھا کہ ماماں سلیپر چڑ چڑ بجاتی وہاں پہنچی اور بولی "چھوٹے مالک! رابو اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔"

سینے میں بپا ہونے والے زلزلے کو میں نے بمشکل چہرے تک آنے سے روکا "کک.......... کہاں ہے وہ؟"

"دونوں باہر کھڑے ہیں۔ کہتی ہے' پہلے مالک سے اجاجت لے آؤ۔"

پہلے تو جی میں آئی کہ فوراً اندر بلا لوں لیکن پھر تحمل سے کام لیا۔ اپنی لرزاں آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا "دیکھ نہیں رہی ہو کام کر رہا ہوں۔ شام کو حویلی میں آجانا۔"

یہ بات میں نے اس لئے کہی تھی کہ یہاں میرے علاوہ دو تین کارندے بھی موجود تھے اور میں کسی کے سامنے رابو کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ماماں چلی گئی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ رابو کیا کہنا چاہتی ہے.......... شام سے ایک گھنٹا پہلے ہی میں حویلی پہنچ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا ہی تھا کہ رابو کی صورت نظر آئی۔ خاوند اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ دونوں اجازت لے کر اندر آگئے۔ رابو نے گلابی پھولدار سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر

اسی رنگ کی موٹی اوڑھنی تھی۔ خاوند عام دیہاتی لباس میں تھا۔ وہ پہلے کی طرح میلا کچیلا نظر آرہا تھا۔ جب کہ رابو پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور کانوں میں جھمکے تھے۔ اسے دیکھ کر دل میں درد کی لہر اٹھی۔ میں نظریں ہٹا کر اس کے شوہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ جھجکتے ہوئے صوفے پر ٹک گئے۔ ایک دو رسمی باتوں کے بعد میں نے دارا سے پوچھا۔

"ہاں بھئی! کیا بات ہے؟ ماماں کہہ رہی تھی' کوئی مسئلہ ہے تمہارا؟"

"نہیں چھوٹے سرکار! مسئلہ تو کوئی نہیں۔ صرف ایک درخواست کرنا تھی آپ سے۔"

"ہاں ہاں' کہو۔"

دارا نے رابو کو ٹہوکا دیا کہ وہ بات کرے۔ رابو نے جوابی ٹہوکا اسے دیا۔ وہ بتیسی نکال کر عاجزی سے بولا "چھوٹے سرکار ادھر ہری پور میں' میں نے چھوٹا سا کھوکھا ڈال رکھا تھا۔ اور بھی کئی لوگ وہاں ٹوکریاں بیچ کر روزی کما رہے تھے۔ تہ باجاری والوں نے سب کو مار بھگایا ہے۔ اوپر سے کام بھی بڑا مندا ہو گیا ہے.......... اگر آپ کے پاس میرا مطلب ہے' فارم وغیرہ میں کہیں گنجائش ہو تو مجھے رکھ لیں۔ رابو آپ کی کھدمت کر لیا کرے گی۔ ہم دونوں کی دال روٹی چلتی رہے گی۔"

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ سوچا بھی نہ تھا کہ رابو جو اتنی دور چلی گئی ہے' ایک دم اس قدر قریب آجائے گی۔ ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ فوراً ہامی بھر لوں اور دونوں سے کہوں کہ کام پر آجایا کریں.......... لیکن پھر وہی ناقابل عبور دیوار سامنے آئی۔ ہمالیہ سے اونچی اور خیالوں سے طویل۔ میرے اندر سے کسی نے کہا۔ "جہانداد! اپنے عذاب میں تختی کا اہتمام مت کرو۔ تم آگ میں جل رہے ہو اور رابو کی موجودگی اس جلتی پر تیل ڈال دے گی۔ تم بھسم ہو جاؤ گے یا ہمالیہ سے اونچی دیوار خاکستر ہو جائے گی" دارا کی امید بھری نگاہیں میرے چہرے کی کشمکش پڑھ رہی تھیں۔ رابو بھی گم صم دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ دارا کی کیا مجال تھی کہ اس چہرے کے پیچھے جھانک سکتا۔ وہ کہانی پڑھ سکتا جو اس کمرے کے گوشوں میں لکھی گئی تھی اور رابو کے سینے میں محفوظ تھی۔ آخر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے دارا' کل تم فارم پر آجانا' میں دیکھوں گا' تم کون سا کام کر سکتے ہو۔ لیکن.......... رابو کی جگہ تو میرا منشی پہلے ہی دو عورتیں رکھ چکا ہے۔"

دارا کے چہرے پر مایوسی جھلکی۔ میں نے کہا "بہرحال تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ محنت کرو گے تو فارم سے اچھی خاصی اجرت مل جایا کرے گی۔"

دونوں ایک ساتھ مجھے سلام کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے رابو سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن بھول ہی گیا کہ کیا پوچھنا تھا۔ بس ہونٹ کھول کر رہ گیا۔ چند لمحے کمرے میں بے ڈھنگی سی خاموشی طاری رہی پھر دونوں نے جھک کر سلام کیا اور الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اگلے روز سے دارا نے فارم پر آنا شروع کر دیا۔ وہ کوتاہ قد لیکن مضبوط جسم کا جوان تھا۔ بڑی جانفشانی سے کام کرتا تھا۔ اس کا دادا بھی ہماری حویلی میں کام کر چکا تھا۔ دارا کو اس بات پر فخر تھا کہ اس کے دادا کی ٹانگ میرے والد کو بچاتے ہوئے کٹی تھی۔ میرے والد چار پانچ برس کے تھے۔ حویلی کے سامنے کھیل رہے تھے کہ ایک دودھ فروش کا ریڑھا بے قابو ہو کر دوڑتا ہوا آیا۔ میرے والد کو ریڑھے کی زد سے بچانے کے لئے بوڑھے ملازم نے بے دریغ ریڑھے کے آگے چھلانگ لگا دی۔ نتیجے میں اس کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور بعد میں کاٹنا پڑی۔ اس قسم کے اور بھی واقعات دارا سناتا رہتا تھا' اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایک روز بہت لجا لجا کر اس نے مجھ سے پچاس روپے ایڈوانس مانگے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ گھر والی کو میلہ دکھانے لے جانا ہے' میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ دلی کیفیت کو چھپا کر میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا "لگتا ہے بہت نخرے اٹھاتے ہو بیوی کے۔"

"وہ بھی تو میرا بہت دھیان رکھتی ہے جی" دارا نے ترت جواب دیا "میرے پسینے پر کھون گراتی ہے۔ پچھلے جے مجھے بکھار ہوا تھا۔ ساری رات میرے سرہانے بیٹھی سر دباتی رہی۔"

دارا بے خبری میں میرے دل پر چرکے لگا رہا تھا۔ میں نے اس تذکرے کو ختم کرنے کے لئے پچاس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور وہ چلا گیا۔ میں گہری ہوتی شام میں اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ ہری فصلوں کے درمیان خاکستری راستے پر وہ اینٹھ اینٹھ کر چل رہا تھا جیسے دنیا جہان کے خزانوں کا مالک وہی ہو اور ایسا غلط بھی کیا تھا۔ رابو اس کے گھر میں تھی۔ وہ رابو جو معمولی ہو کر بھی ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی سونے کی ڈلی.......... اور دارا روز شام کو اس وقت اسی ڈلی کو دریافت کرنے جاتا تھا۔ کتنا خوش نصیب تھا وہ۔ آسمان پر گہرے اودے بادل چھا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا

کے ساتھ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ساون کی ایسی راتوں میں جوان دل رم جھم کی لے پر دھڑکتے ہیں۔ ہر جگہ جل تھل ہو جاتا ہے' جہاں بارش گرتی ہے وہاں بھی اور جہاں نہیں گرتی وہاں بھی۔ دارا اس بارش سے سیراب ہونے کے لئے اپنی کٹیا میں جا رہا تھا اور میں اس بارش میں جلنے کے لئے اپنی عالی شان حویلی کا رخ کر رہا تھا۔ برسات کی ایک ہی رات کتنی مختلف تھی ہم دونوں کے لئے۔

اس رات بارش شروع ہوئی تو مسلسل دو روز ہوتی رہی۔ تیسرے روز بھی یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ بادل گھر گھر کر آتے رہے اور اپنے جھول خالی کر کے نامعلوم سمتوں میں روانہ ہوتے رہے۔ تیسرے روز میں فارم میں بیٹھا تھا کہ علاقے کا ایک بیلدار بہت گھبرایا ہوا میرے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا کہ بڑی نہر کی پٹڑی میں اوپر کی طرف دراڑیں آگئی ہیں اور وہ کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ بڑی روح فرسا خبر تھی۔ ہمارا گاؤں نشیب میں تھا۔ جب کبھی پٹڑی ٹوٹتی تھی' پورا گاؤں چھ چھ فٹ پانی میں ڈوب جاتا تھا۔ اس دوران دو تین اور افراد فارم پہنچے اور انہوں نے بھی یہی اطلاع دی۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے فارم کی طرف سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پولٹری فارم کا چارج سنبھالتے ہی میں نے سب سے پہلے سیلابی ریلے کا انتظام کیا تھا۔ جہاں تک ہماری حویلی کا تعلق ہے وہ بھی خاصی بلندی پر تھی۔ پچھلے پچاس برسوں میں کبھی سیلاب کا پانی وہاں تک نہیں پہنچ سکا تھا لیکن اہل دیہہ کی جان تو عذاب میں آنے والی تھی۔ فارم میں کچھ ضروری انتظامات کرنے کے بعد میں خود بھی گاؤں کی طرف لپکا۔ سوزوکی جیپ میرے پاس موجود تھی لیکن ان حالات میں اسے فارم سے نکالنا ٹھیک نہیں تھا بوندا باندی میں' میں پیدل ہی گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ دارا اور رابو کا خیال آیا۔ ان کا نیم پختہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔ یہ دراصل ایک ڈسپنسری تھی جو عرصے سے خالی پڑی تھی۔ میں نے پٹواری سے کہہ کر یہ جگہ دارا کو دلوا دی تھی۔ میں نے سوچا کہ ریلا آیا تو سب سے پہلے دارا کا گھر ڈوبے گا' لہٰذا اسے اطلاع دینا ضروری تھا۔ میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بارش اب تیز ہو چکی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو دارا کی جگہ رابو باہر نکلی۔ وہ غالباً چھت پر مٹی وغیرہ ڈال رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گارے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ باریک کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ میں اس دلچسپ منظر کو دیکھتا رہ گیا۔ "دارا کہاں ہے" چند لمحے بعد پھنسی پھنسی آواز میرے ہونٹوں سے نکلی۔

"وہ تو شہر گیا ہے۔ کل چھٹی ہے ناں۔ کہتا تھا ضروری کام ہے' دوپہر کو آجاؤں

گا.......... آپ.......... آپ اندر آجائیے ناں۔"

اندر تو میں آ ہی چکا تھا۔ اب تیز بارش سے بچنے کے لئے چھپر تلے آ کھڑا ہوا۔ یہاں رابو جیسی کالی آنکھوں والی ایک بچھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے رابو کے بدن سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا "تت.......... تو تم رات بھر اکیلی رہو گی۔"

وہ بولی "نہیں۔ دارا' ماسی حنیفاں (ماماں) سے کہہ گیا تھا وہ آتی ہی ہو گی۔ شاید تیز بارش کی وجہ سے رک گئی ہے۔"

زوروں سے برستی بارش' گرجتے بادل' تڑپتی بجلی اور ایک تن تنہا چار دیواری میں بھیگا ہوا ایک شعلہ میرے روبرو تھا۔ یکایک میرے سینے میں کوئی گٹھری سی کھلی اور اس میں بندھی ہوئی کوئی شے بکھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ میں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ رابو نے کمزور آواز میں کہا "چھوٹے مالک! اندر آجائیے۔ آپ بھیگ رہے ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے سینے میں کھلنے والی گٹھری سے آگاہ ہو گئی۔ میں ان آنکھوں' ان لبوں کو اور سانس کے اس زیروبم کو پہچانتا تھا۔ کسی دھاگے سے بندھا میں اندر کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ بادلوں نے شام سے پہلے ہی شام کر رکھی تھی اور کمرے میں یہ شام زیادہ گہری تھی۔ میں نے رابو کو روبرو دیکھا اور دفعتاً میرے ہاتھ اس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ذرا سا کسمسائی اور پھر میرے سینے پر ڈھے گئی۔ نجانے کتنی ہی دیر ہم اسی طرح کھڑے رہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر' گرم سانسوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ لمس کی زبان ہمارا ذریعہ اظہار تھی۔ ہاں ان لمحوں میں مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ یہ کتنے لمحے تھے۔ شاید تین چار منٹ' شاید اس سے بھی زیادہ' وہ سرتاپا میرے سپرد تھی۔ کھلی کتاب کی مانند جو تیز ہوا کے دوش پر رکھی تھی اور اپنے ورق خود بخود الٹ رہی تھی۔ چاہ رہی تھی کہ اسے ہر جگہ سے پڑھا جائے۔ لیکن یہ آمادگی ایسی نہیں تھی کہ بری لگتی یا شوق میں رتی بھر بھی کمی کرتی۔ دفعتاً بیرونی دروازے کے عین سامنے آہٹ سنائی دی۔ کوئی پانی میں چپا چپ چلا آرہا تھا۔ وہ تڑپ کر دور ہو گئی۔ میرے ذہن میں آیا شاید ماماں پہنچ گئی ہے لیکن صورت حال کہیں زیادہ تشویشناک نکلی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور دارا اندر آگیا۔ چھپر تلے ٹھہر کر اس نے سر سے بھیگی چادر اتاری اور اسے زور زور سے جھاڑ کر بولا "رابو.......... او رابو۔"

رابو نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری سانس خود بھی گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ بڑے سنگین لمحے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی

تھی۔ میری فوری خواہش یہ تھی کہ دارا کی نظروں سے بچا جائے۔ ساتھ والی کوٹھری میں ایک قد آدم الماری اس مقصد کے لئے موزوں نظر آئی۔ رابو کی نگاہ بھی اسی پر ٹکی تھی۔ میں جلدی سے اس چوبی الماری اور دیوار کے درمیانی خلا میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد دارا کھانستا اور رابو کو پکارتا ہوا اندر آگیا۔ رابو کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کی لرزاں آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"آپ تو شہر گئے تھے؟"

دارا نے تیزی سے کہا "بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے رابو۔ میرا کھیال ہے جلدی سے حویلی کی طرف نکل چلیں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا ہے؟"

"سیلاب آرہا ہے نِکّی۔ چھوٹی نہر ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی بھی جانے والی ہے۔ میں کھود دیکھ کر آیا ہوں۔ پڑی کا برا حال ہے۔ مشکل سے ایک آدھ گھنٹا نکلے گا۔"

رابو کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ یہاں آنے کے بعد کس طرح سیلاب کا خیال میرے دماغ سے نکلا اور جذبات کا سیلاب مجھے بہا لے گیا.......... رابو نے غالباً سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا "اب کیا ہوگا؟"

دارا کی آواز آئی "تم جروری سامان باندھ لو۔ میں حویلی سے سن گن لے کر آتا ہوں۔"

وہ اچھا بھلا دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر دل میں نجانے کیا آئی کہ واپس الماری کی طرف آیا۔ اس نے الماری کے پیچھے جھانکا اور اپنی لاٹھی کھینچنے لگا۔ لاٹھی کیسے نکلتی۔ وہ تو میری کمر اور دیوار کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔ میری اور اس کی نگاہیں ٹکرائیں۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کی دہشت اور حیرت میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ پھر اس کے لب تھرائے۔ "چھو.......... نے.......... مالک" ایک سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اس نے مڑ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ پھر مڑ کر میری آنکھوں میں جھانکا' اور تب جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دو سیکنڈ کے اندر اس کا ذہن دور دور کی خاک چھان چکا تھا۔ قیامت کے لمحے تھے۔ میں بہ آہستگی الماری کی اوٹ سے نکلا۔ اس وقت تک دارا صحن پھلانگ کر بیرونی دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ باہر نکل گیا۔ میں اور رابو ساکت کھڑے تھے۔ وہ ایسی مورتیوں کی طرح جن کے قدم زمین پر گڑے

ہوں اور بے جان ہونے کے باوجود وہ ایستادہ ہوں۔ عقل منجمد اور زبانیں گنگ تھیں

"میں نے چھپنے کی حماقت کیوں کی؟" پچھتاوے کی ایک لہر میرے رگ وپے میں دوڑ گئی۔ صورت حال سنگین ضرور تھی لیکن ٹھنڈے دماغ سے سوچا جاتا تو ایسی سنگین بھی نہیں تھی۔ میں کمرے میں اپنی موجودگی کے لئے کوئی مناسب بہانہ بنا سکتا تھا۔ یہ میرے خیال کا چور تھا جس نے میرے پاؤں تلے سے زمین نکالی۔ آخر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا رابو۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"وہ.......... وہ کہاں گیا ہے؟" رابو نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم؟"

"کہیں وہ آپ کو.......... مم.......... میرا مطلب ہے' آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"نہیں۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر مجھے اس سے خطرہ ہے تو تمہیں زیادہ ہے۔"

"میری کوئی بات نہیں مالک.......... آپ جائیے وہ.......... وہ ایسا تو نہیں ہے۔ پر کہیں غصے میں نہ آجائے۔"

"غصے میں آیا تو اپنا نقصان کرے گا" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ شاید اس طرح میں الماری کے عقب میں پکڑے جانے کا غم غلط کرنا چاہتا تھا۔

رابو بے قراری سے بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے دور تک کھیتوں کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور بارش میں بھیگتی واپس برآمدے میں آگئی "اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں اپنے ذہن سے بار بار یہ سوال پوچھ رہا تھا' لیکن اس سوال کا جواب دارا کے رد عمل سے مشروط تھا' اور دارے کا رد عمل کیا ہوگا' فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابو خاموش کھڑی تھی جیسے سوچنے کا سارا کام اس نے مجھے سونپ دیا ہو اور اب ایک کٹھ پتلی کی طرح میرے اشاروں کی منتظر ہو۔ ابھی میں اسی جان لیوا کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک مانوس شور سنائی دیا۔ میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جان گیا کہ یہ پانی کا شور ہے۔ پڑی ٹوٹ چکی تھی۔ میں اور رابو بھاگتے ہوئے دروازے پر آئے۔ قریباً نصف فرلانگ دور سرخی مائل پانی کا چار فٹ اونچا ریلا چارے کے کھیتوں کو نگلتا چلا آرہا تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ نشیب و فراز کو ایک کرتا'

اچھلتا کودتا پانی' عجیب پھنکار کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیرونی دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ پھر ہم دونوں بھاگتے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ رابو نے جلدی سے جستی پیٹی کھولی اور اس میں سے زیادہ ضروری اشیاء نکال کر باہر رکھنے لگی۔ ریڈیو' بجلی کی استری' ہیٹر' تھوڑی سی نقدی شادی کے دو تین گہنے' دو تین جوڑے کپڑوں کے۔ میں نے یہ ساری چیزیں پوٹلی کی صورت میں بستر کی چادر میں باندھیں اور انہیں بالائی منزل کے اکلوتے کمرے میں پہنچا دیا۔ سیلاب کا پانی اس دوران دروازے پر دستک دینے لگا تھا۔ لکڑی کی درزوں سے پانی کے فوارے نمودار ہو رہے تھے۔ رابو نے حتی الامکان تیزی سے چند لحاف بالائی کمرے میں پہنچائے۔ جب کہ میں ایک پیڈسٹل فین کندھے پر دھر کر اوپر چھوڑ آیا۔ یکایک مکان کی کچی چار دیواری کا ایک حصہ دھڑام سے صحن میں آگرا اور پانی کا پر شور ریلا اندر گھسنے لگا۔ اب چھپر تلے بندھی "بچھڑی" کے سوا کوئی اور چیز محفوظ کرنے والی نہیں تھی۔ میں نے بچھڑی کو کھولا اور ہم دونوں مل کر اسے سیڑھیاں چڑھانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ بچھڑی بدکی ہوئی تھی کچھ سیڑھیوں پر پھسلن تھی' ہماری یہ کوشش قطعی ناکام رہی.......... آخر ہم اسے پانی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اوپر آگئے۔ منہ زور پانی نے آناً فاناً مکان پر قبضہ کر لیا۔ دونوں نچلے کمرے قریباً نوفٹ تک پانی میں ڈوب گئے۔

وہ میری زندگی کی عجیب و غریب رات تھی' گاؤں کی اصل آبادی سے تین چار فرلانگ کی دوری پر ایک تنہا مکان میں رابو اور میں محصور تھے۔ ہمارے چاروں طرف سیلاب کا ٹھاٹھیں مارتا پانی تھا۔ اس پر تیرتی ہوئی اشیاء کے ناقابل شناخت ہیولے تھے' اور یہ خوف تھا کہ کسی بھی وقت یہ مچان نما چوبارہ ہمارے قدموں کے نیچے سے نکل جائے گا۔ دور و نزدیک کسی متنفس کے آثار نہیں تھے۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو چکے تھے یا گاؤں چھوڑ کر اونچی جگہوں کی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا ہماری حویلی میں پناہ گزینوں کا ہجوم ہے۔ پچھلے صحن میں لوگ سائبان تان رہے ہیں۔ مرد و زن ایک دوجے پر چیخ رہے ہیں۔ بچے چلا رہے ہیں۔ حسب معمول میرے منشی کی ہدایت پر دال گوشت کی دیگیں چڑھا دی گئی ہیں اور لنگر کا انتظام ہو رہا ہے۔ یقینی طور پر میری کمی بھی محسوس کی جا رہی ہوگی لیکن کسی کے ذہن میں یہ آ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں اس طرح ایک معمولی کامے کے معمولی مکان میں گھرا ہوا ہوں۔ ملازمین نے پہلے تو یہی سمجھا ہوگا کہ کسی فارم میں رک گیا ہوں اور جب فارم میں نہ پایا ہوگا تو سوچنے لگے ہوں گے کہ میں

قریبی گاؤں حیات پور کی طرف نکل گیا ہوں۔ وہاں کے چودھری ملک حیات کا بیٹا میرا گہرا دوست بن گیا تھا اور میں تفریح طبع کے لئے اکثر جمعرات کی شب ان کے ہاں چلا جاتا تھا.......... شاید پر خطر حالات کے باوجود میں موجود صورت حال سے لطف اندوز ہوتا کیوں کہ وہ عورت میرے ساتھ تھی جو میرے دل کا روگ بنی ہوئی تھی لیکن اس صورت حال سے پیشتر جو کچھ ہو چکا تھا وہ میرے اور رابو کے ذہن میں آہنی میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔ دارا ہمارے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ رابو کا شوہر تھا اور کچھ بھی کر سکتا تھا۔ فوری طور پر تو وہ بھونچکا رہ گیا تھا اور کچھ بھی کہے سنے بغیر یہاں سے نکل گیا تھا لیکن اسے کوئی رد عمل تو ظاہر کرنا ہی تھا۔

رابو کو مجھ سے زیادہ تشویش ہونی چاہئے تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نسبتاً کم پریشان ہے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے گیلے کپڑے بدل لئے اور پھر کسی نہ کسی طرح لالٹین بھی روشن کر لی۔ کمرے میں ایک کہنہ سال کرسی کا ملبہ پڑا تھا۔ اس نے یہ لکڑیاں ایک کونے میں جمع کر کے آگ جلا دی۔ پھر سر جھکائے جھکائے بولی۔

"مالک! قمیض اتار دیجئے.......... میں سکھا دوں۔"

میں نے قمیض اتار دی۔ اس نے نچوڑ کر گھٹنوں پر پھیلا لی اور آگ کے قریب بیٹھ گئی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ جی چاہا وقت تھم جائے اور میں سب تفکرات بھول کر اسے دیکھتا جاؤں لیکن نہ وقت تھمتا ہے اور نہ اس کے پیدا کردہ مسائل مہلت دیتے ہیں۔ دارا کے خیال نے ایک بار پھر میرے ذہن میں پنجے گاڑ دیے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا' جب کہ دارا کے پاس ایک پکی رائفل تھی جو اس نے کسی کباڑیے سے خرید کر ٹھیک کرائی تھی اور فارم میں رکھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی رائفل سے یا کسی اور اسلحے سے مسلح ہو کر یہاں آجاتا تو میں بے بس تھا۔ وہ مجھے یا ہم دونوں کو مار کر لاشیں غائب کر سکتا تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ ہمارا قاتل "پانی" نہیں دارا کا غضب ہے۔

گاؤں کے اور ہمارے درمیان درختوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ حائل تھا۔ رات کے بارہ بجے تک کہیں نہ روشنی دکھائی دی اور نہ کوئی ہماری مدد کو پہنچا۔ پریشانی کے باوجود بھوک بھی اپنا کام دکھا رہی تھی۔ گھر میں اگر خورد و نوش کی کوئی چیز تھی تو وہ نچلے کمروں میں غرقاب ہو چکی تھی۔ اب ہم بالکل تہی دست تھے۔ رابو کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بات پر شرمندہ ہے کہ میرے لئے کچھ کھانے کو فراہم نہیں کر سکتی۔ میں حیران تھا

کہ وہ میرے ہاتھوں اتنا کچھ کھو کر بھی کھانا فراہم نہ کر سکنے پر پشیمان ہے...... اس وقت قریباً ڈیڑھ بجا تھا جب اچانک مجھے کسی کے تیرنے کی آواز آئی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے گردن نکال کر میں نے بغور آواز کی سمت دیکھا۔ بدلیوں کی اوٹ سے پچھلی راتوں کا چاند نکل آیا تھا۔ اس کی مدہم روشنی سیلابی پانی پر چھوٹے چھوٹے ستارے بکھیر رہی تھی۔ ان ستاروں کے درمیان ایک شخص بغلوں کے نیچے کار یا ٹرک کی ہوا بھری ٹیوب دبائے ہماری طرف تیرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ پانی میں زیادہ آواز پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے گردن اندر کر لی اور کھڑکی کے خلا میں سے آنے والے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ قریب پہنچا تو میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ وہ دارا ہی تھا۔ اب میں اس کے کندھے پر افقی رخ سے ٹکی ہوئی رائفل صاف دیکھ سکتا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے رابو کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ بجھے کوئلوں کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ جیسے چھٹی حس نے اسے میرے احساسات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"دارا آیا ہے!" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے خلا میں سے باہر دیکھنے لگی۔ دارا اب بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ تیرتا مکان کے سیدھے رخ پر آ گیا تھا۔ میں نے دوسری کھڑکی کے پٹ وا کئے اور دیکھنے لگا۔ دارا بڑی خاموشی کے ساتھ گری ہوئی چار دیواری میں سے راستہ بناتا ہوا صحن میں آ گیا۔ بچھڑی مر چکی تھی۔ اس کی تیرتی ہوئی لاش کے پاس سے گزر کر وہ زینے پر پہنچ گیا۔ میرے اعصاب پوری طرح تن گئے۔ شاید فیصلہ کن مرحلہ آ گیا تھا۔ وہی لاٹھی جو دارا الماری کے پیچھے چھوڑ گیا تھا' اس وقت میرے ہاتھ میں تھی۔ میں بہ آہستگی چلتا ہوا چوبارے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ کان سیڑھیوں پر لگے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے دارا نے پختہ سیڑھیوں پر دھات کی کوئی چیز رکھی ہے۔ شاید کوئی برتن وغیرہ تھا۔ اس کے بعد دارا کی آواز آئی۔ اس نے جو کچھ کہا وہ مجھے سکتے میں ڈال گیا۔ ایک ہی لمحے میں دل و دماغ تہ و بالا ہو گئے اور میں کسی گونگے بہرے شخص کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ کسی گھن گرج یا للکارے کے بجائے سیڑھیوں سے دارا کی نحیف آواز ابھری تھی۔

"رابو...... روٹی لے جا۔"

یہ فقرہ دوبار دہرایا گیا۔ پھر شپ شپ کی آواز آئی اور دارا ٹیوب کے سہارے

تیرتا ہوا واپس چلا گیا۔ رابو سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو میں نے اسے شانے سے تھام لیا۔ یہ دارا کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ کھڑکی وا کر کے میں نے دیکھا۔ دارا چار دیواری سے نکل کر واپس جا رہا تھا۔ وہ کافی دور چلا گیا تو رابو نے پوچھا "جاؤں...... چھوٹے مالک!"

"نہیں۔ میں خود جاتا ہوں" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر سیڑھیوں پر آ گیا۔

یہاں ایک چمکدار ٹفن پڑا تھا' اسے اٹھاتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس میں دو افراد کا کھانا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن رابو کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ دارا کو یہی کرنا چاہئے تھا جو اس نے کیا ہے۔

O------------☆------------O

اگلے روز علی الصباح پانی دو تین فٹ نیچے چلا گیا۔ میں موقع دیکھ کر دارا کے گھر سے نکلا اور کبھی تیرتا کبھی چلتا ہوا حویلی واپس پہنچ گیا۔ میری غیر حاضری نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ سیلاب زدہ لوگوں کو میری ضرورت ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میں شام تک مختلف امور انجام دینے میں لگا رہا لیکن جب رات گئے فراغت میسر آئی اور میں بستر پر لیٹا تو کل شب کے واقعات فلم کی طرح دماغ میں چلنے لگے۔ لگتا تھا رب نواز کے خانوادے نے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کے لئے مجھے چن لیا ہے۔ رابو کے بعد اب دارا کا فدویانہ کردار سامنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے شک ہونے لگا کہ کہیں یہ میرے اعصاب پر مسلط ہونے کی کوئی سازش تو نہیں۔ مال و دولت کے لئے ابن آدم اور بنت حوا کچھ بھی کر گزرتے ہیں لیکن جب رابو کا سراپا میرے ذہن میں آیا تو یہ سوچ بے معنی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لئے میرے دل کی تڑپ ہی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔

چند روز بعد پانی اتر گیا تو گاؤں میں روز مرہ کے معمولات پھر شروع ہو گئے۔ میں بھی ایک چمکیلی صبح کو فارم میں پہنچا۔ میری توقع کے مطابق دارا کام پر موجود تھا۔ میں سارا دن گاہے گاہے چور نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی چہرے پر یا رویے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سرے سے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ یہ صورت حال میرے لئے خوش گوار تھی...... تین چار دن کے بعد ایک صبح دارا کام پر نہیں آیا۔ میں نے اس کے گھر سے پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ بخار ہے۔ اگلے روز دارا کی جگہ رابو کام پر آ گئی۔ میں اسے دیکھ کر جہاں حیران ہوا وہاں غصہ بھی آیا۔ میں نے اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیوں چلی آئی ہے۔ وہ بولی۔

"مالک.......... دارا نے کہا تھا۔ وہ ذرا بیمار ہے ناں۔"

فارم میں ایک دو عورتیں بھی کام کرتی تھیں لیکن نجانے کیوں مجھے رابو کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میرے خیال میں اس کی جگہ مرغیوں کے بدبودار ڈربوں کے پاس نہیں، میری معطر آغوش میں تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے واپس بھیج دوں لیکن پھر اس خیال سے کہ وہ آنکھوں کے سامنے تو رہے گی میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ روزانہ کام پر آنے لگی۔ اپنی سیاہ آنکھوں میں بھید چھپائے اور بوسیدہ کپڑوں میں میری جان سمیٹے۔ میں نے اپنے آفس کے قریب ہی اسے نسبتاً صاف ستھرا کام دے رکھا تھا۔ ایک روز اکیلے میں، میں نے اس سے پوچھا۔

"دارا نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟"

"جی نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ خوش ہے؟"

وہ چپ ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باہمی تعلقات میں رخنہ پیدا ہو چکا ہے۔ تاہم اس رخنے کے حوالے سے کوئی افسردگی رابو کے چہرے پر دکھائی نہیں دی۔ وہی گھونگٹ، وہی کیموفلاج، وہی اسموک اسکرین، چہرہ گونگا تھا۔ وہ باہر چلی گئی تو میں سوچنے لگا۔ دارا کیا چاہتا ہے۔ وہ سچ مچ بیمار ہے یا اپنی سمجھ اور نظریے کے مطابق "حق نمک" ادا کر رہا ہے.......... کیا وہ مجھے اور رابو کو کھل کھیلنے کی اجازت دے رہا ہے؟" میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ پھر سات آٹھ روز کے بعد دارا نظر آیا۔ اس کا رویہ معمول کے مطابق تھا۔ وہی خدمت، وہی نیاز مندی اور توقیر۔ شام کے وقت مجھ سے کہنے لگا کہ اسے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ میں نے پوچھا کتنے۔ اس نے صرف چار سو روپے مانگے۔ میں نے دے دیئے۔ دوسرے دن رابو کی زبانی پتا چلا کہ دارا کراچی چلا گیا ہے، وہاں کوئی کام ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ دارا کا جانا مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ مجھے بتائے بغیر خاموشی سے نکل گیا تھا۔ اور رابو سے بھی اس نے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے وہ میرے لئے میدان کھلا چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر میں اس "پوزیشن" میں تھا کہ دل کے ارمان نکال سکتا تھا۔ رابو کے حوالے سے اپنی ہر حسرت پوری کر سکتا تھا، لیکن ایسا کرنا ہوتا یا میں کر سکتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ اپنی مقرر کردہ حدود کو توڑنا میرے بس میں نہیں تھا۔ بڑی سیدھی سی بات تھی، میں شادی کے بغیر رابو کو بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔ میرے لئے اب ضروری تھا کہ کسی آخری فیصلے پر

پہنچ جاؤں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ میں رابو کے بغیر زندگی گزار سکتا ہوں یا نہیں۔ اور اگر نہیں گزار سکتا تو رابو کے لئے کیا کچھ قربان کر سکتا ہوں۔ اور اگر صورت حال برعکس ہے تو مجھے فوری طور پر کیا قدم اٹھانا چاہئے۔

بہت دن تک ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر وہی نتیجہ اخذ کیا جو پہلے کر چکا تھا۔ رابو کو شریک حیات بنانا میرے لئے ممکن نہیں تھا اور اب تو یہ کام یوں اور بھی مشکل ہو چکا تھا کہ وہ کسی کی منکوحہ تھی۔ ایک تعلق بنانے کے لئے دوسرا تعلق توڑنے کی مجھ میں ہمت تھی اور نہ میں اس حد تک گرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اندیشوں کے دیو ناچ رہے تھے۔ رابو کے جوبن کی ننگی تلوار ہر وقت میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ آگ اور بارود کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے اس روز سیلاب سے پہلے ایک سیلاب آیا تھا.......... ایسے نادیدہ سیلاب کا رخ موڑنے کے لئے ضروری تھا کہ میں ناقابل بھروسا پاتیوں پر ازدواجی رشتے کا بند باندھ دوں..........شادی کے حوالے سے میرے دھیان میں صرف ایک ہی صورت آسکتی تھی، افروزہ کی صورت۔ پوائزن کی خوشبو میں مہکی ہوئی۔ چاند کی طرح چمکی ہوئی اور اجالوں کی طرح نکھری ہوئی۔ میں دل ہی دل میں پکار اٹھا۔ افروزہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اس جادوئی اندھیرے سے نکلنے کے لئے مجھے تمہاری مومی بدن کی شمع درکار ہے.......... اسی روز میں نے اپنی ہنڈا اکارڈ فارم سے نکالی اور رابو کو اس کے حال پر چھوڑ کر عازم لاہور ہوا۔

زندگی نام ہی حادثات اور انہونے واقعات کا ہے۔ جس روز شاہ جمال لاہور کی ایک عالی شان کوٹھی میں افروزہ سے میرا نکاح ہوا، اسی روز شام کو مجھے گاؤں کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط کراچی سے تھا اور دارا نے لکھا تھا۔ شکستہ لکھائی میں اوٹ پٹانگ جملے تھے۔ اس خط کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

"چھوٹے مالک! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ کو اپنا منحوس چہرہ دکھا سکوں۔ لہٰذا آپ سے اتنی دور چلا آیا ہوں اور اب اور دور جانے والا ہوں۔ جو نوکر اپنے مالک کی خوشیوں کے راستے میں دیوار بنے وہ منحوس ہی تو ہوتا ہے۔ کتنا بدقسمت ہوں میں کہ اس روز میری وجہ سے آپ کو شرمندگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خدا کی قسم ہم لوگ آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ ہمیں ہمارے بزرگوں کی یہی وصیت ہے۔ آپ رابو کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اگر آپ کو تھوڑی بہت خوشی بھی دے سکے تو یہ

اس کی خوش بختی ہوگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ رابو کو طلاق دے دوں۔

آپ چاہیں تو یہ بات ظاہر کر دیں' چاہیں تو صرف اپنے اور رابو تک رکھیں۔ میں نے یہاں ایک واقف کار سے مل کر دوبئی جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ چند روز تک میں کراچی سے بذریعہ لانچ روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں۔"

فقط آپ کا نوکر دارا!

O------------☆------------O

میں اس خط کو دیکھتا رہ گیا۔ تقدیر نے میرے ساتھ ایک بار پھر سنگین مذاق کیا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ سب کچھ دو ہفتے پہلے رونما ہو جاتا تو شاید حالات بہت مختلف ہوتے۔ رابو کے متعلق غور و فکر کرتے ہوئے میں ایک موقع پر بالکل ڈانواں ڈول ہو چکا تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ کبھی سوچ ابھرتی تھی کہ میں رابو کو پانے کا موقع دوسری بار کھو رہا ہوں۔ اس وقت اگر یہ علیحدگی عمل میں آجاتی تو یقینی طور پر فیصلے کی میزان رابو کی جانب جھک جاتی اور عین ممکن تھا کہ میں اسے اپنا لیتا' لیکن اب ایک بار پھر ہم مختلف سمتوں کے راہی تھے۔ میں افروزہ کا شوہر تھا اور اس حوالے سے مجھ پر بہت سی ذمے داریاں عائد ہو چکی تھیں۔

خط میں دارا نے اپنا ٹھکانا نہیں لکھا تھا۔ اس سے رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کا خط تین چار روز اپنے پاس رکھا۔ دن رات سوچتا رہا کہ یہ اطلاع رابو کو کس منہ سے دوں۔ طلاق کی خبر عورت پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ رابو پر یہ بجلی میری وجہ سے گر رہی تھی۔ میں نے اس کا گھر برباد کیا تھا اس کی زندگی اجیرن کی تھی۔ سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال مجھے یہ خبر رابو کو نہیں دینی چاہئے اور اپنے طور پر دارا کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اپنے خط کے مطابق وہ دوبئی روانہ ہوا تھا۔ دوبئی میں میرے جاننے والے موجود تھے۔ وہاں اسے تلاش کرایا جا سکتا تھا تاہم میرے یہ سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ چند دن بعد پتا چلا کہ میرے اندیشوں کے عین مطابق دارا نے ایک رقعہ رابو کو بھی لکھ دیا ہے اور وہ تمام حالات سے آگاہ ہو چکی ہے۔ یہ خبر مجھے ماماں کی زبانی ملی۔ اس نے بتایا کہ تین چار روز پہلے کراچی سے دارا کا کوئی خط رابو کے نام آیا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد رابو دیر تک روتی رہی.......... اور اب تک گم صم

ہے۔ پتا نہیں خط میں کیا لکھا تھا؟ اس سوال کا جواب ماماں کو نہیں مجھے معلوم تھا۔

O------------☆------------O

قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ میں نے گھر بسا لیا اور رابو کو طلاق ہو گئی۔ اس سانحے کی خبر میں نے اور رابو نے اپنے تک محدود رکھی۔ رابو کو دیکھنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تعلق ٹوٹنے پر اسے افسوس ضرور ہوا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا میں سمجھتا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تاثرات سے عاری تھا۔ وہ عام سے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ نفرت یا تحقیر تو دور کی بات ہے' مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے سرد مہری بھی نظر نہیں آئی۔ جیسے جو کچھ ہوا اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا' کوئی کچھ بھی نہ کرتا تو بھی یہ ہو کر رہتا۔ وہ پرستش میں ہر انتہا سے گزر جانے والی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اپنی قسمت پر شاکر' ہمیشہ کی طرح سراپا عجز و انکسار میرے سامنے کھڑی رہی۔

شاید رابو کا یہی عجز و انکسار اور یہی خود سپردگی تھی جس کے سبب وہ بطور شریک حیات میرے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ میں فطری طور پر مشکل پسند تھا۔ مجھے ایک کنیز کی نہیں بیوی کی ضرورت تھی۔ جس کا اپنا طمطراق ہو' اپنی رائے ہو' ناز و نخرے ہوں۔ جو میرے شانہ بشانہ چلے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ افروزہ ان شرائط پر پوری اترتی تھی۔ وہ ایک طرح دار لڑکی تھی' حسن اور دولت سونے پر سہاگا تھا۔ گھر میں ہوتی تو تاریک در و دیوار جگمگا اٹھتے' محفل میں ہوتی تو مرکز نگاہ بن جاتی وہ ایم ایس سی کر چکی تھی۔ یعنی کوالیفکیشن میں بھی مجھ پر برتری حاصل تھی۔ شادی سے پہلے افروزہ کے والد انوار صاحب نے میرے سامنے جو شرائط رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ تین چار سال کے اندر اندر مجھے اپنی زمینوں سے اٹھ کر شہر میں سکونت اختیار کرنا ہوگی۔ میرے خیال میں تین چار سال کی مہلت بہت تھی۔ اس دوران میں بتدریج اپنی زمینوں اور فارم وغیرہ سے فارغ ہو سکتا تھا۔ ساتھ ساتھ لاہور میں بھی کاروباری طور پر پاؤں جمائے جا سکتے تھے۔ بہرحال اگلے تین چار برس افروزہ کو حویلی ہی میں گزارنا تھے۔ میرے لئے ضروری تھا کہ حویلی کو آرام و آسائش کے اعتبار سے لاہور کی عالیشان کوٹھیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کروں۔ پیسے سے کیا ممکن نہیں۔ میں نے بھی شادی کے بعد تین چار ماہ کے اندر اندر حویلی کی کایا پلٹ دی۔ اب وہ حویلی باہر سے تو گاؤں میں کھڑی تھی لیکن اندر سے نیویارک' پیرس یا لندن میں پائی جاتی تھی۔ سوئمنگ پول' ٹینس کورٹ' وسیع ٹیرس' قیمتی ساز و سامان سے آراستہ اور سینٹرلی ائیر کنڈیشنڈ' افروزہ اور دیگر احباب کی

گاڑیوں کے لئے میں نے حویلی سے جلال پور تک ڈیڑھ میل طویل پختہ سڑک ذاتی خرچ پر تعمیر کرانے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ افروزہ اپنے ساتھ بیش قیمت جہیز بمع ایک فیکٹری تو لائی ہی تھی' نوکروں کا ایک چھتا بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ ان میں ایک اس کی ذاتی ملازمہ تھی۔ ایک ٹینس کوچ' ایک سائیس جو اس کے چار پالتو گھوڑوں کے ناز اٹھاتا تھا اور ایک باڈی گارڈ۔ ٹینس کوچ تو دو تین ماہ بعد واپس چلا گیا لیکن باقی تین ملازمین مستقلاً حویلی کے ہو رہے۔ ایک معروف صنعتکار فیملی کا داماد بننے کے بعد میرے سماجی مرتبے میں خاصا اضافہ ہوا۔ اردگرد کے زمیندار اور سرکردہ لوگ مجھ سے دبنے لگے۔ کئی مسائل جو اس سے پہلے پیچیدہ نظر آتے تھے' خود بخود حل ہو گئے لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ میں نے بھی شادی پر اور اس کے بعد حویلی کی شان و شوکت بڑھانے پر تیس چالیس لاکھ روپیہ نقد کھویا۔ چار پانچ مربع زمین بیچی اور کئی دوسرے مسائل بھی پال لے۔ زندگی اچانک ہی بے پناہ مصروف ہو گئی۔ جیسے کوئی گاڑی کسی گلی سے نکلے اور دفعتاً ایسی مصروف شاہراہ پر آجائے جس پر کم از کم رفتار سو میل فی گھنٹہ ہو اور سیکڑوں گاڑیاں آندھی کی رفتار سے اڑی جا رہی ہوں۔ افروزہ کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ یہ سب اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ آئے دن حویلی کے سامنے قیمتی گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ شکار' سیر' پکنک' گھریلو فنکشن ہر وقت ہلا گلا رہتا۔ یہ سب کچھ میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں ان حالات کے لئے نہ صرف پہلے سے تیار تھا بلکہ پوری طرح لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ یہ ہنگامے ہی تو مجھے درکار تھے۔ ان مصروفیات میں رابو کا خیال اس طرح آتا تھا جیسے گھرے بادلوں میں کسی وقت اچانک بجلی چمک جائے۔ میں رابو کی جانب سے بے خبر نہیں تھا۔ ایک طرح سے اس کے مسائل میرے ہی پیدا کردہ تھے اور میں اسے ان مسائل کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ دوبارہ ماماں کے پاس آگئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے پرانے کوارٹروں میں ایک بار پھر خالہ بھانجی اکٹھی رہنے لگی تھیں۔ میں نے ماماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ رابو کو کام پر نہ لایا کرے تاہم بہانے بہانے سے میں ماماں کو چند سو روپے دے دیا کرتا تاکہ اسے رابو کی کفالت میں آسانی رہے۔

نوبیاہتا بیوی کے ساتھ میرے شب و روز خوب گزر رہے تھے۔ وہ لاکھ ماڈرن سہی مگر میرے مزاج کو سمجھتی تھی۔ شادی کے تین چار ماہ بعد ہم میں چھوٹے موٹے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ہم نے افہام و تفہیم سے ان پر بہ آسانی قابو پالیا۔ یہ شروع فروری کی ایک چمکیلی سہ پہر کا ذکر ہے۔ میں اور افروزہ لان میں کرسیاں ڈالے چائے پی

رہے تھے۔ سبز گھاس پر سفید کرسی' سفید کرسی پر گلابی ساڑھی اور گلابی بدن' جو میری ملکیت تھا' جس کے سارے اثاثہ جات میرے تھے۔ میں افروزہ کو محویت سے چائے کی چسکیاں لیتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کسی سوچ میں تھی۔ اچانک پلکیں جھپکا کر بولی۔

"جہانداد! یہ رابو کیا ماماں کی بیٹی ہے؟"

اس اچانک حملے پر میں اندر سے ہل گیا۔ اچانک یہ رابو کا ذکر کہاں سے آٹپکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے دل کا چور اچھل کر آنکھوں میں آبیٹھے گا اور وہاں سے چیخ چیخ کر افروزہ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔ میں نے نگاہیں پیالی پر مرکوز کر دیں۔ لہجے کو نارمل رکھ کر پوچھا۔ "کس رابو کی بات کر رہی ہو تم؟"

"وہی جو ماماں کے ساتھ کوارٹر میں رہتی ہے۔ سانولے سے رنگ کی اونچی ناک والی۔"

"اچھا وہ.......... وہ بھانجی ہے اس کی لیکن دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ شاید بیٹی ہے۔ کافی صورت ملتی ہے ان کی۔"

"سنا ہے اس کی شادی بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں' خاوند دوبئی گیا ہوا ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے اسے چھوڑ گیا ہے۔ شاید طلاق بھی ہو چکی ہے۔"

میں افروزہ کی معلومات سے پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کم آمیز ہونے کے باوجود حویلی اور گاؤں کے حالات سے خاصی باخبر رہتی تھی۔ میرا بلڈ پریشر لو ہونے لگا۔ آخر اس تمہید سے کیا مطلب تھا۔ کہیں وہ میرے اور رابو کے تعلق سے آگاہ تو نہیں ہو گئی تھی۔ اگر ایسا ہوا تھا تو یہ میرے ماضی اور میری اعلیٰ ذوقی کے لئے کوئی اچھا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے افروزہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ بولی "عشیر خاں نے اشاروں کنایوں میں مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔"

"کیا مطلب۔" میں بری طرح چونکا۔

اس نے چائے کی چسکی لی اور مسکرا کر بولی "شادی وادی کرنا چاہتا ہے اس سے۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "عشیر خاں اس مکروہ چہرہ باڈی گارڈ کا نام تھا جو افروزہ کے جہیز میں دوسرے ملازموں کے ساتھ آیا تھا۔ عجیب بے ڈھنگا شخص تھا۔ قوی ہیکل جسم کے مقابلے میں سر چھوٹا تھا اور بازو بہت لمبے تھے۔ ان لمبے بازوؤں میں شاید لمبی آستینوں

کا بھی دخل تھا۔ جو ہر وقت اس کی نصف ہتھیلی تک لٹکی رہتی تھیں۔ مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں جیسے کسی تن ساز نے بازوؤں کے مسل دکھانے کے لئے کہنیوں کو اوپر اٹھا رکھا ہو۔ رنگ سفید تھا لیکن چہرے پر چھوٹے چھوٹے داغ سے تھے۔ عمر کوئی چالیس سال رہی ہوگی۔ مجھے یہ شخص پہلی نگاہ میں ہی اچھا نہیں لگا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب بھی موقع ملا اس شخص کو حویلی سے فارغ کرنے میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ جذبات کو قابو میں رکھ کر میں نے عام لہجے میں پوچھا۔

"عشیر نے کہاں دیکھا تھا اس لڑکی کو؟"

"یہیں حویلی میں دیکھا ہوگا۔" افروزہ نے کہا "تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے وہ سات پردوں میں چھپی ہوئی کوئی چودھرانی ہے۔"

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ کوئی انڈر اسٹینڈنگ وغیرہ بھی ہے ان دونوں میں۔" میں نے مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"بھئی ہوگی تو وہ کہہ رہا ہے ناں! اور میرے خیال میں ایسی لڑکی کے لئے عشیر خاں ہر طرح مناسب شخص ہے۔ غریب مطلقہ کو پوچھتا کون ہے۔"

میں نے بے ساختہ کہا "وہ مطلقہ نہیں ہے۔"

وہ بولی "جہانداد صاحب! اپنے ملازموں کے بارے میں آپ کی معلومات خاصی واجبی سی ہیں۔ میں نے کئی عورتوں سے سنا ہے کہ رابو کا شوہر اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ ابھی تو وہ پھر بھی کسی کے پلے بندھ سکتی ہے۔ تین چار سال گزر گئے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

میں نے کہا "لیکن تم ایک دم اس کے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہو گئی ہو؟"

وہ ہنسی "آخر چودھرانی ہوں میں۔ بچے بچیوں کی شادیاں کرانا' الجھے معاملات سلجھانا' لوگوں میں راضی نامے کرانا' یہ سب میری ذمے داریاں ہیں چودھری صاحب۔"

اس کا خیال تھا کہ میں اس کے بزرگانہ لب و لہجے پر قہقہہ مار کر ہنس دوں گا لیکن میرے سینے کی اتھل پتھل سے وہ آگاہ نہیں تھی۔ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیجئے جو مزاج یار میں آئے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی "ویسے جہانداد اگر سچ مچ یہ رشتہ ہو جائے تو کیسا رہے۔ بڑے کام کا بندہ ہے یہ عشیر خاں۔ ہر وقت جاں ہتھیلی پر رکھتا ہے۔ بابا جانی کو بڑا بھروسا ہے اس پر۔ پچھلے سال ہماری شیخوپورہ والی مل میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس اکیلے نے دو

ڈھائی سو ورکروں کو سیدھا کر دیا تھا.......... یوسف زئی قبیلے سے ہے۔"

میں نے کہا "لیکن عمر کا خاصا بڑا ہے۔"

"وہ بولی "وہ کون سی ٹین ایجر ہے۔"

میں نے کہا "چالیس سال سے کم تو نہیں ہوگا وہ۔"

"بھئی ایج کو چھوڑ دو۔" افروزہ نے ناک سکوڑی۔ "ڈیل ڈول کا اچھا ہے۔ صحت مند ہے۔ اپنے قبیلے میں اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے لیکن کہتا ہے 'نہیں پنجابن سے شادی کروں گا.........."

افروزہ اپنے ملازم کی بھرپور وکالت کر رہی تھی۔ میں نے اس بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ "ٹھیک ہے چودھرانی جی۔ آپ جیتیں ہم ہارے۔ ہماری طرف سے بات پکی۔ آپ کل دلہا کو لے کر آجائیے۔ نکاح گیارہ بجے' تناول ماحضر بارہ سے ایک بجے تک' رخصتی باہمی صلاح مشورے سے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت لشکارے مارنے لگے۔ کچھ دیر بعد سنجیدہ ہو کر بولی "بھئی تم تو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ میں نے کوئی انہونی بات تو نہیں کہہ دی۔"

میں نے کہا "میں کب کہتا ہوں انہونی کہہ دی ہے لیکن ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ کسی دن میں ماماں سے بات کروں گا۔"

اس رات میں دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ رابو میری کچھ نہیں تھی۔ میں اسے دو بار نظر انداز کر چکا تھا۔ لیکن جب اس کا نام کسی کے ساتھ آتا تھا تو میرے دل و دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں۔ یہ کیسا جذبہ تھا۔ کیا نام تھا اس دیوانگی کا؟ میں نے آتش گیر سوچوں کو حقیقت پسندی کے چھینٹے دیئے اور غور کرنے لگا۔ افروزہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایک غریب مطلقہ کو کون پوچھتا ہے۔ کون معقول شخص دہرے گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔ عشیر خان کیسا بھی تھا بہرحال ایک توانا مرد تھا۔ برسر روزگار بھی تھا اور افروزہ اسے عرصے سے جانتی تھی۔ مجھے اس بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ یہ سوچ میری ذمے داری تھی۔ آج سے تین برس پہلے ایک بوڑھی عورت اپنی یتیم بیٹی کو میرے سپرد کر گئی تھی۔ وہ یتیم بیٹی میری "سرپرستی" کے بہت دکھ اٹھا چکی تھی۔ یہاں تک کہ طلاق کا داغ بھی اس کے ماتھے پر لگ چکا تھا۔ اگر اب بھی میں اپنی ذمے داری محسوس نہ کرتا اور اس موج موج بھٹکتی کشتی کو کنارے لگانے کی تگ و دو نہ کرتا تو یہ رذالت کی انتہا تھی۔

اگلے روز میں نے عشیر خاں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ پچھلے چار ماہ سے حویلی میں تھا لیکن میں نے شاید ہی کبھی اس سے دو تین فقروں سے زیادہ گفتگو کی ہو۔ اور جب تک کسی سے کھل کر بات نہ کی جائے اس کے اندر کی کیا خبر ہو سکتی ہے۔ میں نے پاس بٹھا کر اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ مختلف سوال جواب کیئے۔ اس تحقیق کے آخر میں میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عشیر خان کے حق میں نہیں جاتا تھا بلکہ یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اس ملاقات کے بعد وہ مجھے پہلے سے بھی بیگانہ لگا۔ وہ ایک کھوکھلا سا باتونی شخص تھا جسے اپنی عقل سے زیادہ جی داری اور وفاداری پر ناز تھا۔ جی داری کا دعویٰ تو شاید آدھ پون درست ہی ہو لیکن وفاداری والی بات میرے حلق سے نہیں اتری۔ اس کے بجائے وہ مجھے خاصا موقع پرست دکھائی دیا۔

میں نے مزید سن گن لینے کے لئے حویلی کے ایک پرانے ملازم شکر الٰہی کو منتخب کیا۔ ملازم پیشہ لوگ ایک دوسرے کے متعلق بخوبی جانتے ہیں اور بعض کو تو ایک دوسرے کی مکمل فیملی ہسٹری ازبر ہوتی ہے۔ شکر الٰہی ریٹائرڈ فوجی تھا' دوسری طرف عشیر خاں کو بھی دعویٰ تھا کہ وہ کچھ عرصہ فوج میں رہا ہے۔ اس حوالے سے وہ دونوں شناسا تھے۔ تنہائی میں' میں نے شکر الٰہی سے پوچھا کہ عشیر خاں کیسا آدمی ہے۔ شکر الٰہی کے چہرے پر جو پہلا تاثر ابھرا وہ میرے لئے خاصا ناقابل فہم تھا۔ اس تاثر میں سب سے نمایاں چیز کراہت تھی۔ شکر الٰہی ادب سے بولا "چھوٹے مالک' آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر عشیر خاں کا گھر بسا دیا جائے۔"

شکر الٰہی کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔ بولا "اس کا مطلب ہے آپ عشیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

میں واقعی کچھ سمجھ نہیں پایا میں نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "عشیر خاں سے کسی عورت کو بیاہنے کا مطلب اس بیچاری کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو وہ اس سے پہلے دو بیویاں قبر میں اتار چکا ہے۔ تیسری لاہور کے اسپتال میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ افروزہ نے مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی.......... ناقابل یقین سا بیان تھا شکر الٰہی کا۔ میں نے کہا "شکورے! پہیلیوں میں بات نہ کرو۔ جو کہنا ہے کھل کر کہو۔"

شکر الٰہی کی آنکھوں میں پراسرار سائے لہرائے۔ وہ آگے کو جھک کر سرگوشی میں بولا۔ "چھوٹے مالک' عشیر خاں کو کوڑھ ہے۔ کبھی آپ نے اس کی بھویں نہیں دیکھیں' کیسی جھڑی جھڑی سی ہیں اور کان بھی نیچے سے سوجے رہتے ہیں۔ کبھی غور نہیں کیا آپ نے؟.......... یہ سب کوڑھ کی نشانیاں ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک ہی لمحے میں عشیر کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے اس کی آستینیں یاد آئیں جو آگے تک لٹکی رہتی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں جن کی رنگت عجیب سی تھی۔ مجھے سوچ میں دیکھ کر شکر الٰہی نے کہا "یہ بات تو اب خاصی مشہور ہو گئی ہے جی لیکن آپ کی وجہ سے لوگ چپ ہیں.......... میں نے خود ایک دن عشیر خاں کے بازو دیکھے تھے۔ وہ کھال پر بیٹھا منہ دھو رہا تھا۔ پیچھے کماد کا کھیت تھا۔ میں کماد سے نکلا تو میری نظر سیدھی عشیر پر پڑی۔ اس کے بازو کہنیوں تک عجیب طرح کے ہیں۔ ان پر نہایت مہین خشخاشی دانے سے ہیں۔ عشیر نے مجھے اپنے بازوؤں کی طرف گھورتے پایا تو جلدی سے اٹھ کر آستینیں نیچے گرا لیں۔"

میں نے کہا "تم نے اس سے کچھ پوچھا نہیں؟"

شکر الٰہی بولا "پوچھنا کیا ہے مالک۔ یہ سو فیصد پکی بات ہے۔ اسے کوڑھ ہے۔ بے شک آپ کسی ڈاکٹر حکیم کو بلا کر دکھا لیں۔"

یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ جذام ایک متعدی مرض ہے۔ ایسے مریض کا عام لوگوں میں گھل مل کر رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف عشیر خان میری بیگم کا چہیتا نوکر تھا۔ یقینی طور پر وہ بھی اس کی بیماری سے آگاہ ہو گی۔ اس کے باوجود وہ اسے گاؤں ساتھ لے آئی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ شکر الٰہی نے جو کچھ بتایا ہے' یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ دیکھنے کے لئے افروزہ سے بات کرنی چاہئے.......... ویسے دل ہی دل میں مجھے افروزہ پر بھی طیش آ رہا تھا۔ اگر عشیر واقعی بیمار تھا تو افروزہ کو کیا حق پہنچتا تھا کسی بے سہارا لڑکی کی زندگی برباد کرنے کا۔

اس روز رات کو بیڈ روم میں' میں نے افروزہ سے عشیر خاں کی بات چھیڑی۔ اس کی بیماری کا ذکر کیا تو وہ افسوس سے دائیں بائیں سر ہلانے لگی۔ "جہانداد! تم بھی کمال کرتے ہو۔ بابا جانی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دیہات میں رہنے والوں کی سوچ بھی دیہاتی ہو جاتی ہے۔ تم تو لیپروسی کا نام ایسے لے رہے ہو جیسے لوگ دو ہزار سال پہلے لیا کرتے

تھے۔ محترم! لیپروسی اب کوئی ایسا خوفناک یا ناقابل علاج مرض نہیں رہا۔ اور ابتدائی اسٹیج پر تو اس پر قابو پانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔ دو سال پہلے عشیر خاں میں ابتدائی علامتیں نمودار ہوئی تھیں۔ مناسب علاج کے بعد اب وہ بھلا چنگا ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ بھی چند ماہ میں دور ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس سے پہلے وہ دو بیویوں کی زندگی سے کھیل چکا ہے۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ "توبہ........ توبہ........ توبہ........ جاہنداد' تم تو نمک کی کان میں بالکل نمک ہو گئے ہو۔ کیسی بچگانہ بات کر رہے ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ عشیر کی دو بیویاں عشیر کی بیماری کا شکار ہو کر مر گئی ہیں۔ لیکن جناب! یہ عشیر ابھی زندہ کیوں ہے........ یہ خود تو مرا نہیں اور دوسروں کو مارتا چلا جا رہا ہے۔"

"تو کیا یہ بیویوں والی بات جھوٹ ہے۔"

"جو بات تم تک پہنچی ہے وہ تو جھوٹ ہی ہے۔ عشیر کی صرف ایک بیوی مری ہے اور وہ بھی لیپروسی سے نہیں' بجلی کا جھٹکا لگنے سے۔ یقین نہیں ہے تو تصدیق کر سکتے ہو۔ دو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے کہا "اور ایک بیوی اس کی اسپتال میں ہے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عشیر کی وجہ سے بیمار ہوئی ہے جب عشیر سے اس کی شادی ہوئی تو وہ بھلا چنگا تھا۔ لیپروسی کی شکایت اسے بعد میں ہوئی۔ ڈاکٹر کہتا ہے اور میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کو لیپروسی تھی جس سے بعد ازاں عشیر بھی متاثر ہوا۔"

میرے فیصلے کی قطعیت محسوس کر کے افروزہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ درحقیقت وہ اپنے طور پر کچھ شرمندہ بھی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھ سے عشیر کی بیماری چھپائی تھی بلکہ اس کی سابقہ دو یا تین شادیوں کا ذکر بھی گول کر گئی تھی۔ پھر سب کچھ جاننے کے بعد میں نے عشیر کے متعلق جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی خاصا مصالحانہ تھا۔ میں نے صرف اس کی شادی کا ذکر موخر کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے فوراً حویلی بدر کرنے کا مطالبہ کر دیتا۔ اس واقعے کے بعد ایک تبدیلی ضروری آئی۔ رابو کا گھر بسانے کا خیال میرے دل میں جم گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کوئی مناسب شخص دیکھ کر رابو کا بیاہ کر دیا جائے۔ یہ میرے لئے ایک نہایت ناخوشگوار فریضہ تھا مگر اس سے روگردانی اور

بھی ناخوشگوار تھی۔ میں غیر ارادی طور پر اپنے مطلوبہ شخص کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ ایک دن میں نے اس سلسلے میں ماماں سے بھی بات کی۔ ماماں کی سوچ میری توقع سے مختلف نکلی۔ وہ کہنے لگی "چھوٹے مالک! آپ ان داتا ہیں۔ ہمارے لئے جو سوچیں گے بھلا ہی سوچیں گے۔ آپ رابو کو کسی پتھر سے بھی بیاہ دیں گے تو وہ ساری جندگی اس سے لگ کر بیٹھی رہے گی۔ پر جہاں تک اس کی اپنی مرجی ہے........ میرا کھیال ہے کہ وہ بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "تم اس کی نہیں اپنی سوچ بتاؤ۔ کیا وہ پہاڑ جیسی زندگی اس طرح کاٹ سکے گی۔"

ماماں بولی۔ "مالک! میں تو چاہتی ہوں کل کے بجائے آج اس کا بیاہ ہو جائے پر........ میرا مطلب ہے........ ایک بار آپ اس سے بھی پوچھ لیں۔"

ماماں کے ساتھ طویل گفتگو سے اندازہ ہوا کہ رابو ابھی ذہنی طور پر اس صورت حال کے لئے تیار نہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ شادی والے باب کو ابھی کچھ عرصے تک نہ کھولا جائے۔ بعض معاملات وقت کے ساتھ ساتھ خود سدھر جاتے ہیں اور اس سدھار میں پائیداری بھی زیادہ ہوتی ہے۔



زندگی اپنے راستے پر گامزن رہی۔ وہی حویلی' وہی مہمان نوازیاں' وہی تفریحات وہی افروزہ اور اس کی شاہانہ مصروفیات۔ اس دوران ایک بار افروزہ حاملہ بھی ہوئی لیکن پھر ابارشن کرانا پڑا۔ عشیر خاں بدستور حویلی میں تھا۔ اس سے میری نفرت اور کراہت مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نفرت اور کراہیت کا سبب اس کی بیماری نہیں اس کی شخصیت تھی۔ عجب پراسرار سا کردار تھا وہ۔ الگ تھلگ خاموش لیکن بے حد ہوشیار اور ہر چیز پر عقابی نگاہ رکھتا ہوا۔ اہل دیہہ تو الگ رہے' حویلی کے ملازمین بھی اس سے کنی کتراتے تھے۔ آجا کے ایک شکر الٰہی تھا جس کے پاس وہ بیٹھتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی رائفلیں گود میں رکھ لیتے۔ اپنی پگڑیوں کو دیہاتی انداز میں کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر گرہ لگاتے۔ اس طرح آرام کرسی سی بن جاتی۔ وہ زمین پر بیٹھے آگے پیچھے جھولتے اور باتیں کرتے رہتے۔ اس گفتگو میں زیادہ حصہ شکر الٰہی کا ہی ہوتا تھا۔ عشیر خاں بس کبھی کبھار اپنا چھوٹا سا سر اقرار یا انکار میں ہلا دیتا۔ میں نے شکر الٰہی کو خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ "اسرار کے اس پتھر" میں جونک لگا رہے۔ یہ نہ ہو وہ خاموشی سے کوئی کام دکھا جائے اور ہم دیکھتے

ہی رہ جائیں۔ خاص طور پر میں رابو کے بارے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق عشیر خاں کی شہرت کسی حوالے سے بھی اچھی نہیں تھی۔ اس کی دوسری بیوی جسے بعض لوگ تیسری بھی کہتے تھے اور جو لاہور کے ایک خیراتی اسپتال میں زیر علاج تھی' زبردستی اٹھا کر لائی گئی تھی اور اٹھانے والا عشیر خاں تھا۔ یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے اس نے ایک شخص کی دونوں ٹانگیں بھی توڑ دی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں رابو یا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ بھی کوئی ایسا معاملہ ہو جائے۔ شکر الٰہی مجھے عشیر کے متعلق وقتاً فوقتاً رپورٹ دیتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے ایک بالکل مختلف بات بتائی' کہنے لگا۔

"چھوٹے مالک! عشیر خاں امریکا جا رہا ہے۔"

عشیر خاں اور امریکا؟ میں حیرت سے شکر الٰہی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ بولا "آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ سرخ رنگ والا صاحب مجھے امریکا لے کر جائے گا۔ انگلیوں کے علاج کے لئے۔"

"سرخ رنگ والے صاحب" کا اشارہ میں سمجھ گیا۔ شکر الٰہی جیکسن کی بات کر رہا تھا۔ جیکسن' افروزہ کے فیملی فرینڈز میں سے تھا۔ نیلی آنکھوں والا اونچا لمبا خوبرو نوجوان تھا۔ میں خود بھی دراز قد ہوں لیکن اس کے روبرو کھڑے ہونے سے کتراتا تھا۔ وہ امریکی ریاست انڈیانا کا رہائشی تھا اور افروزہ کے "پاپا جانی" سے اس کے کاروباری تعلقات تھے۔ افروزہ اور جیکسن کی مشترکہ دلچسپی ٹینس تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا دونوں بیشتر وقت ٹینس کھیلتے رہتے تھے یا پھر لطیفہ گوئی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ افروزہ کے شوہر کی حیثیت سے مجھے یہ شخص اچھا نہیں لگا۔ شاید میری جگہ کوئی شوہر بھی ہوتا' ایسا ہی محسوس کرتا۔ تین ہفتے پہلے افروزہ کا "لارنس" نامی عربی گھوڑا بیمار ہو گیا تھا۔ اس کا کافی علاج معالجہ کیا گیا مگر "محترم" کی طبیعت نہیں سنبھلی۔ جیکسن نے آتے کے ساتھ ہی پہلا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اس نیم مردہ گھوڑے میں جان دوڑا دی۔ اس سلسلے میں اس کی خاصی رقم بھی خرچ ہوئی۔ اس نے اسلام آباد میں کسی گورے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا پھر اس کے ذریعے انگلینڈ سے قیمتی دوائیں منگوائیں۔ خاصی تگ و دو کے بعد مثبت نتیجہ نکلا اور گھوڑا "پہلے جیسا" ہو گیا۔ گھوڑے کی تیمارداری میں ولائتی جیکسن کی بے پناہ لگن میرے دیسی سینے میں کھدبد پیدا کرتی رہتی تھی۔ اب میں یہ دوسری خبر سن رہا تھا۔ جیکسن' عشیر خاں کو امریکا لے جا رہا تھا۔ عربی گھوڑے کی طرح یہ عجمی عشیر خاں بھی افروزہ کا چہیتا

تھا۔ یعنی افروزہ کی ہر چہیتی شے پر یہ سفید فام صدقے واری جانے کو تیار تھا۔ پہلے پہل تو میں اپنے ان خیالات کو بے پناہ قوت ارادی سے جھٹکتا رہا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ تادیر ایسا نہیں کر سکوں گا۔ وہ شک جو ازل سے مرد کے سینے میں پلتا ہے اور تن بدن میں زہر بھرنے لگتا ہے' میرے سینے میں بھی نمو پا چکا تھا۔ میں نے افروزہ سے بات کی تو اس نے میری اطلاع کی تصدیق کی۔

بولی "آج صبح ہی بات ہوئی تھی۔ میں خود تم سے ذکر کرنے والی تھی۔"

میں نے کہا "لیکن ہمیں کیا ضرورت ہے جیکسن کا اتنا بڑا احسان سر پر لینے کی۔ اگر تم ایسا کرنا ہی چاہتی ہو تو خود کر لو۔ تمہارے پاس کوئی کمی ہے۔ یا میں نے کبھی تمہیں روکا ہے خرچ کرنے سے۔"

وہ بولی "بات خرچ کی نہیں جہانداد' احساس کی ہوتی ہے' اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جیکی ہم سے زیادہ حساس ہے۔ اس میں کراہیت اور نفرت کی بجائے محبت اور جستجو ہے۔ اتنا عرصہ ہو گیا کبھی تم نے عشیر خاں کو چھونے کی ہمت کی ہے۔ جیکی روز اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس سے باتیں کرتا ہے۔ حوصلہ دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے طور پر اس کا درد بانٹنا چاہتا ہے۔ تو ہم اس نیکی سے کیوں روکیں اسے؟"

میں نے دل میں سوچا "نیکی کے کام تو اور بھی بہت ہیں مسز جہانداد.......... اس سفید فام نے سارے صالح اعمال کے لئے میری ہی حویلی کیوں منتخب کی ہے۔" شاید میں یہ بات کہہ بھی دیتا لیکن کروڑوں کا جہیز میرے حلق میں ٹھس گیا اور ایک وسیع فیکٹری ٹیپ کی طرح ہونٹوں پر چپک گئی۔

○----------☆----------○

وہ ایک تاریک شب تھی۔ کسی بدنصیب کی طرح کالی اور بیوہ کی طرح خاموش۔ نجانے وہ کونسا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ ایک بار جب میری آنکھ لگ جائے تو بہت گہری نیند سوتا ہوں۔ کئی بار احساس ہوا کہ جس کروٹ سویا تھا اسی کروٹ اٹھ بیٹھا ہوں' لیکن ان دنوں دیگر معمولات کی طرح میرا یہ معمول بھی بدلا ہوا تھا۔ رات میں ایک دو بار آنکھ ضرور کھل جاتی۔ میں جاگا تو خوابگاہ میں مکمل تاریکی تھی۔ منہ میں وہسکی کی ہلکی سی تلخی اور کانوں میں باجے گاجے کا شور تھا۔ اس وہسکی کو پیے اور ان باجوں کو سنے دو تین گھنٹے ہو چکے تھے لیکن بازگشت ابھی باقی تھی۔ حویلی میں ہونے والی گیٹ ٹوگیدر کی یہ تقریب شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہی تھی اس کے بعد میں اور افروزہ

سونے کے لئے آ گئے تھے.......... اور اب آنکھ کھلنے کے باعث میں بیڈ پر اکڑوں بیٹھا تھا.......... اچانک مجھے احساس ہوا کہ افروزہ بیڈ پر نہیں ہے۔ میں نے ٹیبل لیمپ آن کیا۔ خالی بیڈ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ باتھ روم میں تاریکی تھی اس کا مطلب تھا وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ میرے سینے میں ہردم سلگنے والا شک اچانک ہی الاؤ بن کر بھڑک اٹھا۔ رات کے تین بجے افروزہ کہاں تھی۔ سلیپر پہن کر اور ٹیبل لیمپ بجھا کر میں بہ آہستگی خوابگاہ سے نکلا۔ میرے قدم خود بخود حویلی کے اس حصے کی طرف اٹھ گئے جہاں جیکسن اپنے پالتو کتے کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ اس نایاب کتے کی قیمت پندرہ ہزار روپے اور وزن بمشکل ساڑھے سات سو گرام ہوگا۔ میں دبے پاؤں جیکسن کے کمرے میں پہنچا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ اچانک مجھے کمرے سے ٹیڈی کتے کی مہین آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کی زیریں درز سے منہ لگا کر اپنے مالک کو پکار رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ جیکسن کمرے میں نہیں ہے۔ یعنی رات کے تین بجے جیکسن اور افروزہ دونوں اپنے کمروں میں نہیں تھے۔ خود بخود میرا دھیان چھت کی طرف چلا گیا۔ میں محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا لیکن ابھی چھت پر پہنچا بھی نہ تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ جیکسن کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ وہ چھت پر کھلنے والے دروازے کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ وہ کسی کو تھامے ہوا تھا۔ انگریزی میں بولا "میری بات تو سنو' دو سیکنڈ کے لئے رک جاؤ۔ دیکھو یہ ٹھیک نہیں۔"

جواب میں افروزہ کی آواز نے میرے کانوں میں سیسہ پگھلایا۔ "بس جیکی' میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ امریکا اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ میں اب شادی شدہ ہوں۔ ہمارے راستے بہت مختلف ہو چکے ہیں۔"

"پلیز فری۔" جیکی روہانسا ہو کر بولا "مجھے اتنا بددل نہ کرو کہ میں خودکشی کرلوں۔ پلیز.........."

"جیکی' سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس راستے میں بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں نہیں معلوم ہمارے ہاں شادی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے افروزہ کا لہجہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ غالباً جیکی نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ افروزہ چپ ہو گئی اور میرے اندر پرکھوں کا آتش گیر خون جوش مار گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا میں کہاں اور کیوں کھڑا ہوں۔ ایک آتش فشاں سینے میں پھٹا اور رگ و پے میں لاوا بہہ نکلا۔ میں عالم خود فراموشی میں دروازے سے ٹکرایا اور چھت پر پہنچ گیا۔ میرے تصور میں جیکسن کی سرخ توانا گردن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اکڑے ہوئے ہاتھ اس لمحے کے انتظار میں تھے

جب وہ گردن ان کے شکنجے میں ہوتی اور وہ اس جسم سے زندگی کی آخری رمق تک نچوڑ لیتے۔ میں نے اپنی جلتی آنکھوں کے سامنے افروزہ اور جیکسن کے ہیولے دیکھے۔ ان کے خدوخال کو پہچانا اور غراتا ہوا جیکسن کی طرف بڑھا۔ مجھے یاد ہے میری غراہٹ سننے کے بعد دونوں ہیولے ایک یا دو قدم پیچھے ہٹے تھے اور شاید افروزہ کی مدھم سی چیخ بھی ابھری تھی۔ میں نے جیکی کا ٹینٹوا دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے لیکن مطلوبہ چیز میرے ہاتھ میں نہیں آئی۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ نہ ہی میرے احسانوں تلے دبا ہوا کوئی مزارعہ یا مزدور تھا۔ وہ ایک صحت مند' حاضر دماغ شخص تھا۔ میری چستی چالاکی اس کے آگے پانی بھرتی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور میرے جبڑے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بھرپور مکا کھا کر میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ لڑکھڑایا تو عقب میں دروازے کا خلا تھا اور خلا میں نیچے جاتی سیڑھیاں تھیں۔ دروازے سے گزر کر میں سیڑھیوں پر گرا اور آنکھوں میں چراغاں ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے میں ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو گیا۔ ان لمحوں میں کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دوبارہ سلسلہ سماعت و بصارت بحال ہوا تو میں نے خود کو تاریک کمرے میں پایا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا جا چکا تھا اور دو بے حد مضبوط اور بے رحم ہاتھ میری کلائیوں کو پشت پر جوڑ کر کھردری رسی سے باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جیکسن کے ہاتھ تھے۔ باتھ روم سے آنے والی مدھم روشنی میں افروزہ نظر آئی۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا وہ کیا کر رہی ہے۔ یہ سارا منظر ہی خواب کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ میرے سیڑھیوں پر گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اس نے کسی ملازم یا ایک سے زیادہ ملازموں کو جگا دیا تھا اور وہ آواز کی وجہ جاننے کے لئے جیکی کے کمرے کے سامنے گھوم رہے تھے۔ افروزہ انہی کی نقل و حرکت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ میں قالین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس لئے جب افروزہ کھڑکی سے ہٹ کر میرے سر پر آن کھڑی ہوئی تو مجھے اس کے پاؤں اور لرزاں شلوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی صدا جیسے کہیں بہت دور سے آئی۔

"خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اوہ مائی گاڈ.......... اب کیا ہوگا جیکی؟"

"تم کسی طرح اپنے کمرے میں پہنچو۔ میں اسے سنبھال لیتا ہوں۔"

"کک.......... کہیں.......... کچھ ہو نہ جائے۔ یہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا' زخم کافی گہرا ہے۔"

"ہائے اللہ جیکی.......... اسے.......... کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔"

"میں کہتا ہوں، تم وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے کمرے میں پہنچو، صبح تک چپ چاپ پڑی رہو۔ اور ہاں، یہ اپنی آستین اچھی طرح دھو لینا۔"

افروزہ کی دور افتادہ آواز سنائی دی۔ اس آواز میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا

"دیکھو.......... جیکی.......... کہیں.......... قاتل نہ بن جانا۔"

"نہیں بنوں گا۔ نہیں بنوں گا۔ تم جاؤ" جیکی دانت پیس کر غرایا۔

میرے دائیں رخسار اور گردن پر گرم گرم سیال بہہ رہا تھا۔ یقیناً سر پر کوئی بہت گہرا زخم آیا تھا۔ گہرے زخم کے تصور ہی سے مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ میں نے منہ کے اندر زبان گھما کر حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی لیکن اس قسم کی ساری کوششیں فضول تھیں۔ میرا دائرہ سماعت ایک بار پھر ہر قسم کی آوازوں سے خالی ہونے لگا۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا.......... یا مر رہا تھا۔

O------------☆------------O

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو موٹے بان کی بدبودار سی چارپائی پر پایا۔ یہ ایک نیچی چھت والا نیم تاریک کمرا تھا۔ کچی زمین پر ایک صندوق اور صندوق پر دو لحاف رکھے تھے۔ سلاخوں والی ایک کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ بند تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور میں کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ مجھے چارپائی کے ساتھ رسی سے باندھا گیا ہے۔ منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ کہیں قریب ہی موٹر چلنے کی مدہم آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی چھوٹا سا واٹر پمپ تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں اور اس وقت کہاں ہوں۔ ہاں یہ بات یقینی تھی کہ اس دفعہ میری بے ہوشی کا دورانیہ خاصا طویل رہا ہے۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ دفعتاً ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اس مقام کو تقریباً پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری حیرت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ اگر میرا قیافہ درست تھا تو میں اپنے گاؤں اور حویلی سے قریباً تیس کلو میٹر دور سرگودھا جانے والی سڑک کے نواحی علاقے میں موجود تھا۔ میں اس جگہ ایک دفعہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس وقت افروزہ اور اس کے پاپا جانی میرے ساتھ تھے۔ وہ مجھے "جہیز کا سامان" دکھانے نکلے ہوئے تھے۔ سرگودھا روڈ سے ملحقہ یہ چار کینال کا پلاٹ بھی افروزہ کے جہیز میں شامل تھا۔ چار دیواری بن چکی تھی۔ گیٹ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف

نیچی چھت والے دو کمرے بنے تھے۔ یہاں انوار ملز کے کسی غریب ورکر نے بمع اہل و عیال رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ڈیڑھ دو کینال میں سبزیاں کاشت کی گئی تھیں۔ سبزیوں کی آبپاشی کے لئے واٹر پمپ چل رہا تھا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ میں اسی جگہ پہنچایا گیا ہوں۔

میں قریباً ایک گھنٹا اسی طرح چارپائی پر بندھا پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے کمرے کی تیرگی کم ہو گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ صبح ہو رہی ہے۔ آخر دروازے سے باہر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے تالا کھولا اور اندر آ گیا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ عشیر خان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی، جس میں چند توس اور فرائی انڈا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ بارہ بور کی طاقتور رائفل حسب معمول عشیر کے کندھے پر تھی۔ وہ بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہی شخص جو کل تک مجھے چھوٹے مالک کہتا تھا اور سر جھکائے مودب کھڑا رہتا تھا بلا تکلف مجھ سے ایک قیدی کا سلوک کر رہا تھا۔ اس نے میرے بالائی دھڑ سے رسی کے چند بل ڈھیلے کر کے میرے ہاتھ آزاد کر دیئے اور ناشتے کی پلیٹ میرے سینے پر سجا دی۔ پھر میرا منہ کھولنے کے بعد بولا۔

"کھالو.......... لیکن آواز وغیرہ نہ نکالنا ورنہ وقت سے پہلے ہی مارے جاؤ گے۔"

میں نے کراہتے ہوئے پوچھا "تمہاری مالکن کہاں ہے؟"

وہ غرایا "میں نے کہا نہیں کہ آواز مت نکالو۔ خاموشی سے کھالو ورنہ ابھی ٹھوبڑا باندھ دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "عشیر خان، تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

اس نے تڑپ کر رائفل ہاتھ میں لی اور بلا دریغ میرے زخمی سر سے لگا کر بولا "مجھے گولی مارنے کی اجازت ہے اور میرے اندر کلیجا بھی ہے گولی چلانے کا۔ سنی ہے میری بات.........." پھر وہ غصے سے لرزتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے سینے پر گرم پلیٹ تھی اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو براہ راست نتھنوں میں گھس رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی عشیر خان کے جذام زدہ ہاتھ بھی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خواہش کے باوجود میں پلیٹ سے کچھ نہیں لے سکا.......... میرا چیخنا چلانا نہ صرف عشیر خان کو مشتعل کر سکتا تھا بلکہ بے سود بھی تھا۔ میری یادداشت کے مطابق اس پلاٹ کے گرد دور دور تک جگہ خالی پڑی تھی۔ بے ہوشی سے پہلے کے واقعات ڈراؤنی فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے

گزرنے لگے۔ افروزہ اور جیکسن کے چہرے تصور میں آئے اور سینے سے درد کی ایک شدید ٹیس ابھر کر پورے بدن میں پھیل گئی۔ افروزہ کا آخری فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ اس فقرے میں اس نے جیکسن سے کہا تھا کہ کہیں وہ مجھے مار کر قاتل نہ بن جائے۔ لیکن مجھے زندہ چھوڑنا اب ان دونوں کے لئے اتنا آسان نہیں تھا۔ غالباً سوچ بچار کے لئے کچھ وقت حاصل کرنے کے لئے ہی مجھے حویلی سے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا افروزہ اور جیکسن کی سوچ بچار کتنی بھی طویل ہو اس کا نتیجہ میرے حق میں نہیں نکلے گا۔ وہ آخر کار اس فیصلے پر پہنچیں گے کہ مجھے بار زندگی سے آزاد کر دینا بہترین حل ہے۔ میں سوچنے لگا حویلی میں کیا صورت حال ہوگی۔ یقیناً وہاں میری گمشدگی کا ڈراما رچایا گیا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ اس حویلی میں پولیس بھری ہو اور غور کیا جا رہا ہو کہ میرے اغوا کے شبے میں کس کس زمین دار پر ہاتھ ڈالا جائے۔ میرے بعد حویلی میں کرتا دھرتا میرے چچا آصف جاہ تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے درویش منش شخص تھے۔ انہیں بہکانے میں افروزہ جیسی عورت کو زیادہ دشواری نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں منشی خادم حسین کو دال میں کالا نظر آسکتا تھا۔ مگر یہاں تک تو اس کی سوچ بھی نہ پہنچ سکتی تھی کہ میرے "غم میں نڈھال" میری بیوی ہی میری قاتلہ ہے۔ اور اس کا ساتھی وہ ہمدرد اور غم گسار جیکسن ہے جو انسان تو کیا کسی جانور کو بھی آزردہ نہیں دیکھ سکتا۔ کوڑھی سے ہاتھ ملاتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود بھی کوڑھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ کوڑھ اوپر سے نظر نہیں آتا۔

جیکسن کے متعلق سوچتے سوچتے میرا دھیان اپنی طرف چلا گیا۔ جیکسن کی طرح میں بھی تو کوڑھے اخلاق کا مالک تھا۔ میرے فکر و عمل میں بھی یہی مرض پھیلا ہوا تھا۔ میں نے رابو سے جو زیادتیاں کی تھیں وہ آج میرے سامنے تھیں اور بعین اسی شکل میں۔ جس حال کو میں پہنچا تھا۔ یہ مکافات عمل کا پرتو تھا۔ کل میرے ہاتھوں رابو کا گھر برباد ہوا تھا۔ آج جیکسن نے میرا آشیانہ بکھیر دیا تھا اور جیکسن کی معاون وہ اعلیٰ خاندانی عورت تھی جسے غریب رابو پر ترجیح دے کر میں بڑے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ جس کی دلکشی، رعنائی اور فضیلت کے میں نے قصیدے پڑھے تھے اور جس کی امارت میری جہاندیدہ آنکھوں کا تارا تھی۔ آج نہ وہ امارت رہی تھی، نہ وہ دلکشی و رعنائی اور نہ ہی ان نعمتوں سے مستفیض ہونے والی زندگی بچتی نظر آتی تھی۔ ایسے میں رابو کا مانوس چہرہ پوری شدت سے ابھر کر میرے تصور میں آگیا۔ کشادہ پیشانی، جھکی جھکی پلکیں اور ان کے

نیچے دو خوبصورت ترین ہونٹ، میں نے سوچا، رابو کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟

○------------☆------------○

اس تنگ و تاریک جگہ میری اسیری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوئی۔ تقریباً بیس روز میں نے اسی چھت کے نیچے سنگین اندیشوں کے چنگل میں گزار دیے۔ میرا مستقل پہریدار عشیر خان تھا۔ تاہم خالص دیہاتی خدوخال والا ایک منحنی سا شخص بھی اکثر نظر آجاتا تھا۔ اس کا نام نذیر تھا اور وہ عشیر خان کو "خان صیب" کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے دو وقت کا کھانا عشیر خان پہنچاتا تھا۔ رات نو اور دس بجے کے درمیان آدھ گھنٹے کے لئے مجھے کمرے سے نکال کر احاطے میں چہل قدمی کے لئے لاتا تھا۔ اس دوران وہ بندوق گود میں رکھے مجھے عقابی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ مجھے چارپائی سے باندھنا ترک کر دیا گیا تھا بلکہ چار پانچ روز پہلے تک تو میرے ہاتھ پاؤں بھی نہیں باندھے جاتے تھے۔ بس عشیر خان کمرے کو باہر سے قفل لگا کر دروازے کے سامنے چارپائی ڈال لیتا تھا، لیکن اب پھر رات کے وقت میری مشکیں کسی جانے لگی تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پانچ روز پہلے میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ کمرے کی چھت بالکل عارضی قسم کی تھی۔ کیکر کے بالے ڈال کر اوپر "سرکیاں" اور مٹی وغیرہ ڈال دی گئی تھی۔ ایک رات دس بجے کے بعد میں نے چارپائی پر کھڑے ہو کر چھت تک رسائی حاصل کی اور ایک آہنی پتری سے سرکیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ اس مقام پر دو کڑیوں کے درمیان اتنی جگہ ضرور تھی کہ میں باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ سرکیاں کٹ گئیں تو میں نے مٹی ہٹانا شروع کی۔ ابھی بمشکل چھت میں چھوٹا سا سوراخ ہی ہوا تھا کہ عشیر خان قفل کھول کر دندناتا ہوا اندر آگیا اور اپنی واہیات زبان میں مجھ پر برسنے لگا۔ پھر اس نے نذیر کو ہدایت کی۔ وہ کہیں سے ایک زنگ آلود زنجیر لے آیا۔ اس زنجیر سے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے اور یہی سلوک میرے پاؤں سے کیا گیا۔ اس واقعے کے بعد میرے لئے فرار کا ہر امکان معدوم ہو گیا تھا۔ اب میں تھا، یہ منحوس چار دیواری تھی اور موت کا انتظار تھا۔ موت جو ہر لمحے ننگی تلوار کی طرح میرے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا اس چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے اور کس رات سونے کے بعد مجھے جاگنا نصیب نہیں ہوگا۔ ہر بار جب دروازہ کھلتا یہی لگتا کہ افروزہ اور جیکسن کی طرف سے میرا بلیک وارنٹ جاری ہو گیا ہے اور کریہہ المنظر عشیر خان اپنی رائفل کی گولی میرے سینے میں اتارنے آیا ہے۔ میں نے اس چار

دیواری سے باہر کے حالات جاننے کے لئے عشیر خان سے بہت سر کھپایا۔ لیکن اس نے ایک بات کر کے نہیں دی۔ وہ ایک ایسے مجسمے کے طرح تھا جس کے منہ میں پتھر کی زبان بھی نہیں تھی۔

وہ میری اسیری کا آٹھواں نواں ہفتہ تھا۔ رات ہو چکی تھی لیکن نجانے کیوں عشیر خان نے آج مجھے نہ احاطے میں گھمایا تھا اور نہ ہی پابند سلاسل کیا تھا۔ قرب و جوار میں ایک نامانوس سی خاموشی طاری تھی۔ شاید آج پھر عشیر نے زیادہ مقدار میں دیسی شراب چڑھالی تھی اور انٹا غفیل پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک روز اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر وہ پتا نہیں کون سے راگ الاپتا رہا تھا۔ اس روز میں نے عشیر کی زبان سے اور بہت سی خرافات کے علاوہ رابو کا نام بھی سنا تھا۔ وہ غالباً نذیر سے رابو کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی جوانی کو کچی گری سے تشبیہ دے کر کچر کچر کھانے کی خواہش بیان کر رہا تھا۔ اس کی ساری باتیں میرے پلے نہیں پڑی تھیں لیکن جو کچھ بھی میں نے سنا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رابو اس کے دل میں گہری اتری ہوئی ہے۔

کافی دیر میں اپنی کوٹھڑی میں بوسیدہ کھاٹ پر پڑا اس غیر معمولی خاموشی پر غور کرتا رہا۔ پھر کھاٹ سے اتر کر دروازہ پر پہنچا' اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اگر کمرے کا فرش پھٹ جاتا اور اندر سے کوئی نامعلوم مخلوق برآمد ہو جاتی تو مجھے اتنی حیرانی نہ ہوتی جتنی دروازہ کھل جانے پر ہوئی تھی۔ میں دہلیز پار کر کے تیزی سے باہر نکلا۔ مختصر برآمدہ تاریک تھا اور وسیع احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ اس وقت چار دیواری میں کوئی متنفس نہیں ہے۔ میں دو رویہ کاشت کی ہوئی سبزیوں کے درمیان چلتا بیرونی دروازے تک پہنچا۔ بیرونی دروازے کا قفل کنڈی میں جھول رہا تھا لیکن کنڈی کھلی تھی۔ آزادی کی خواہش برق بن کر میرے سراپے میں دوڑ گئی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ آج کئی ہفتے بعد میں باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ سیکڑوں سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے سے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں نے ایک رخ متعین کیا اور بھاگتا چلا گیا۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد رات کے ایک بجے میں لاہور کے بند روڈ پر اپنے ایک دیرینہ دوست بشیر ناطق کے گھر رکشے سے اتر رہا تھا۔ یہ شخص فرنیچر کا کام کرتا ہے' اس کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی شغف ہے۔ رات کے ایک بجے مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر

وہ ششدر رہ گیا۔ حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلا تو بغل گیر ہو کر مجھے اندر لے گیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی' سر پر میلی کچیلی پٹی تھی اور لباس پر ابھی تک دو مہینے پہلے کے خونی دھبے تھے۔ ناطق کے گھر والے بھی جاگ گئے اور بے پناہ حیرت سے میرا جائزہ لینے لگے۔ ناطق کی زبانی پتا چلا کہ میری گمشدگی کی خبر دور دور تک پھیل چکی ہے۔ اس نے پندرہ بیس روز پہلے کے کئی اخبارات مجھے دکھائے۔ ایک روزنامے میں میری تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ منشی خادم حسین کی تصویر دیکھ کر میں چونک گیا۔ بے پناہ تجسس کے ساتھ جلدی جلدی میں نے تمام خبریں پڑھ ڈالیں۔ یہ خبریں میرے لئے غیر متوقع نہیں تھیں لیکن انہیں پڑھ کر سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری گمشدگی کا سبب افروزہ اور جیسکن ہیں۔ افروزہ نے اپنے "پارٹنر" کے ساتھ مل کر اس سارے معاملے کو بڑی ہوشیاری سے ہینڈل کیا تھا۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے بیانات سے تفتیش کا رخ باآسانی میرے قریبی ملازمین کی طرف موڑ دیا تھا۔ خاص طور پر منشی خادم حسین نشانہ بنا تھا' اور دو ہفتے پہلے پولیس نے اسے میرے سیف سے بیس ہزار روپے نقد اڑانے اور بعد ازاں مجھے اغوا کرانے کے الزامات میں گرفتار کر لیا تھا۔ افروزہ کے بیانات کے مطابق وقوعہ سے اڑتالیس گھنٹے پہلے کسی ملازم نے میرے سیف سے رقم نکال لی تھی۔ منشی خادم کے علاوہ سیف تک کوئی رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ "مجھے" بھی منشی پر شک تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی کاروائی عمل میں لائی جاتی میں حویلی سے اٹھوا لیا گیا۔ ناطق اور اس کے اہل خانہ بھی ان خبروں کو درست تسلیم کر رہے تھے لہٰذا ناطق نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ میں خادم حسین کے چنگل سے کیسے نکلا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سب کچھ میں اسے بعد میں بتاؤں گا فی الحال وہ فوراً کسی آدمی کو خوشاب بھیجے اور گاؤں سے تازہ ترین صورت حال معلوم کرائے۔ ناطق نے میری ہدایت پر عمل کیا اور اسی وقت اپنے ایک بااعتماد بندے کو گاؤں دوڑا دیا۔

یہ شخص اگلے روز شام کے وقت لاہور واپس پہنچا۔ اس وقت تک میں نہا دھو کر اپنی ہیئت بدل چکا تھا اور آئندہ اقدامات کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اس شخص نے بتایا کہ میری بیوی افروزہ حویلی میں ہی ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں اور پولیس بھی تندہی سے کیس کی تفتیش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں پرسوں میرے دو زمین دار دوستوں کو بھی شامل تفتیش کیا گیا ہے۔ منشی خادم حسین کا دوسری بار جسمانی ریمانڈ لیا گیا ہے اور وہ مقامی تھانے میں ہے۔ اس شخص کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ جیسکن ابھی

تک حویلی میں ہے اور اتنا کے ان دنوں میں افروزہ کی "ڈھارس" بندھا رہا ہے۔

جیکسن اور افروزہ بڑے اطمینان سے حویلی میں موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ میری طرف سے قطعی بے فکر ہیں' ان کا خیال ہے کہ میں جہاں پہنچا دیا گیا ہوں وہاں سے اپنی دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ ایسا سوچتے ہوئے دو سوال خود بخود ذہن میں ابھرتے تھے۔ پہلا یہ کہ مجھے قتل کیوں نہیں کیا گیا؟ اور دوسرا یہ کہ ان حالات میں میری رہائی کیسے عمل میں آگئی۔ پہلے سوال کا جواب زیادہ دشوار نہیں تھا۔ افروزہ اور جیکسن کا مقصد اپنے گناہ کا اخفا تھا اور وہ مجھے منظر سے ہٹا کر اس مقصد میں کامیاب رہے تھے ممکن تھا کہ کچھ دنوں تک وہ خود میں اتنا حوصلہ پیدا کر لیتے کہ میرا قتل انہیں آسان محسوس ہونے لگتا۔ دوسرا سوال خاصا توجہ طلب تھا۔ آخر ایکا ایکی ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ عشیر خان میرے پنجرے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گیا تھا۔ کیا وہ کسی پولیس چھاپے سے خوف زدہ ہو کر بھاگا تھا یا کوئی تیسری پارٹی اسے اٹھا کر لے گئی تھی۔ یا پھر؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہرحال یہ بات ظاہر تھی کہ جو کچھ بھی ہوا ہے میری بے وفا بیوی اور اس کے آشنا کے حق میں اچھا نہیں ہوا اور عنقریب میرے ہاتھ ان کی گردن پر ہوں گے۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ افروزہ اور اس کے آشنا کا کچا چٹھا کھول کر قانون کے سامنے رکھ دوں اور انہیں عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانے کی کوشش کروں لیکن اس میں دونوں گھرانوں کی زبردست بدنامی تھی اور میں ایک عورت کے جرم کی سزا درجنوں بے گناہوں کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ خاموشی سے حویلی واپس چلا جاؤں۔ جیکسن کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دوں اور بعد میں افروزہ کو بھی طلاق تھما دوں۔ میں نے دوسرا راستہ ہی اختیار کیا اور اگلے روز صبح دس بجے حویلی واپس پہنچ گیا۔

میں پختہ سڑک سے ایک کلو میٹر پیدل چل کر گاؤں پہنچا۔ میں بشیر ناطق کے لباس میں تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ منہ' سر چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ جب تک میں حویلی میں داخل نہیں ہو گیا' کسی کو میری آمد کا پتا نہیں چلا۔ میں سیدھا حویلی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ یہاں افروزہ' اس کے والد اور جیکسن کے علاوہ میرے چند عزیز بھی موجود تھے۔ مجھے یوں اندر آتے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ زیادہ بری حالت افروزہ اور جیکسن کی ہوئی۔ میرے چچا آصف جاہ اور دوسرے عزیز دھاڑیں مارتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے کن انکھیوں سے جیکسن کی طرف دیکھا۔ وہ مٹی کا بت بنا کھڑا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زمین پھٹ جائے یا آسمان اسے نگل لے۔ غالباً اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا

کہ میں اس بندی خانے سے رہائی حاصل کر سکوں گا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کمرے سے نکل بھاگے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا اور اس کی خوفزدہ آنکھوں میں جھانک کر کہا "تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مسٹر جیکسن۔"

"وائے ناٹ.......... وائے ناٹ" وہ بے حد کھسیانے انداز میں بولا۔ اس کا لمبا چوڑا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ اسی شام جیکسن نہایت خاموشی کے ساتھ حویلی سے غائب ہو گیا۔ افروزہ سے ابھی تک سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بعد ازاں مجھے ملاقاتیوں نے گھیر لیا۔ میری واپسی کا سن کر سیکڑوں افراد حویلی میں اُمڈ آئے تھے۔ سو پچاس مجھ تک پہنچ گئے تھے اور کئی گنا باہر دروازوں پر کھڑے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ کبھی کبھی لوگوں کا خلوص اور پیار بھی وراثت میں ملتا ہے۔ ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میری واپسی کو اس طرح سراہا جاتا۔ احباب کو سنانے کے لئے میں نے ایک مبہم سی کہانی گھڑلی تھی۔ یہ کہانی میری زبان سے بار بار "ری پیٹ" ہو رہی تھی۔ میں نے سارا الزام چند ایسے فرضی افراد پر دھر دیا تھا' جن سے میرا لین دین کا تنازعہ تھا اور وہ مجھے زبردستی ساتھ لے گئے تھے معلوم نہیں میرے اس بیان پر یقین کیا گیا یا نہیں اور اگر کیا گیا تو کس حد تک' بہرحال میں اصل معاملے کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ شام کے کھانے کے بعد جب میں حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں میری نگاہ ماماں پر پڑی۔ میں ایک عرصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی افسردگی مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ معلوم نہیں اس پر کیا زیادتی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پاس بلایا۔ وہ حسب معمول سر جھکا کر اور سلام کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ وہ سینے میں کوئی زلزلہ چھپائے ہوئے تھی۔ دفعتاً میرا دھیان رابو کی طرف چلا گیا۔ میں نے نرمی سے پوچھا "رابو تو ٹھیک ہے۔"

یہ مختصر سا فقرہ بارودی فلیتے کے لئے چنگاری ثابت ہوا۔ ماماں کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔ اشکوں کا طوفانی ریلا بہہ نکلا۔ وہ اتنی شدت سے اور ایسے ٹوٹ کر روئی کہ دیواریں لرز اٹھیں۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے چہرہ چادر کے دامن میں چھپا لیا تھا اور دلدوز گریہ کر رہی تھی۔

"کیا ہوا ماماں.......... کیا ہوا؟" میں بار بار پوچھتا چلا گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہتی بھی تو اپنے آنسوؤں اور ہچکیوں کو روک نہیں سکتی تھی۔ میرا دل ہول

کر رہ گیا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ دو تین ملازمائیں سر جھکائے خاموش کھڑی تھیں۔ چہروں پر کوئی دکھ بھری تحریر تھی۔ میں نے ملازمہ شکورن کو اپنے پاس بلایا "شکورن! کیا بات ہوئی ہے۔ رابو تو ٹھیک ہے؟"

شکورن کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ سب کے سامنے کچھ نہ بتا سکے۔ میں اسے لے کر کمرے میں آ گیا' اور کہا کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر تسلی سے سب کچھ بتائے۔ کچھ دیر گڑبڑانے کے بعد شکورن نے کہا " مالک! لوگوں نے رابو کو گاؤں سے نکال دیا ہے.........."

میں سناٹے میں رہ گیا "کیوں نکال دیا ہے؟"

"پیرو جی نے کہا تھا۔"

پیرو جی اس علاقے کا جھاڑ پھونک والا تھا۔ اس کے علاوہ حکمت بھی کرتا تھا۔ لوگ اسے بڑا دانا سمجھتے تھے۔ میں نے بھڑک کر پوچھا۔ "پوری بات بتاؤ۔ پیرو جی نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

شکورن کے چہرے پر ایک بار پھر زبردست کشمکش کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ رک رک کر بولی "پیرو جی کا خیال تھا کہ رابو کا گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں ورنہ دوسرے لوگ بھی بیمار ہو جائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ رابو کو.......... کک.......... کوڑھ ہو گیا ہے۔"

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ جی چاہا' ایک زوردار تھپڑ سامنے کھڑی شکورن کو مار دوں اور اس سے پوچھوں کہ دو مہینے پہلے تو وہ اچھی بھلی تھی اب کوڑھی کیسے ہو گئی ہے لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ شکورن بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کوئی ڈھنگ کی بات مجھے بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے جھڑک کر باہر بھیج دیا' اور اپنے معتمد چوکیدار شکر الٰہی کو بلایا۔ شکر الٰہی گھبرایا ہوا اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ کیا پوچھا جائے گا۔ میں نے کمرے کو اندر سے کنڈی لگائی اور شکر الٰہی نے جو کچھ جانتا تھا' میرے سامنے اگل دیا۔ میں حیرت اور کرب میں غلطاں سنتا رہا۔ شکر الٰہی سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

میری گمشدگی کے دو ہی روز بعد عشیر خان نے سر راہ رابو سے چھیڑ خانی کی اور دھمکی دی کہ وہ اسے اٹھا کر قبائلی علاقے میں لے جائے گا۔ رابو نے اس بات کی شکایت گھر آ کر ماماں سے کی۔ آناً فاناً یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ پہلے ہی عشیر خان سے بے

حد متنفر تھے۔ ان کی نفرت دو چند ہو گئی اور وہ اس زیادتی کے خلاف متحد ہو گئے۔ حویلی میں میرے چاچا آصف جاہ سے شکایت کی گئی۔ انہوں نے حسب مقدور عشیر خان کو ڈانٹا ڈپٹا اور افروزہ سے بھی کہا کہ وہ اس شخص کو لگام دے کر رکھے۔ تاہم گاؤں کے لوگ اس رسمی کارروائی سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ بدقماش عشیر خان پھر رابو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ گاؤں کا ایک خوش حال زمین دار حاجی نثار جو کاروباری حد تک میرا حریف بھی تھا' رابو اور ماماں کو عارضی طور پر اپنے گھر لے گیا۔ گاؤں کے دیگر افراد نے بھی اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ عشیر کی کوئی مجرمانہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ دو ہی ہفتے بعد یہ اڑی اڑی سی خبر ملی کہ رابو' عشیر خان سے ملنے چودھری کے پرانے ڈیرے پر جاتی ہے۔ باخبر لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ چند روز بعد اس خبر کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ گاؤں کے کچھ مہم جو لڑکوں نے رابو اور عشیر کو پرانے ڈیرے سے رنگے ہاتھوں جا پکڑا۔ عشیر تو چکمہ دے کر نکل گیا مگر رابو کی بہت درگت بنی۔ لوگ اسے مارتے پیٹتے گاؤں لائے اور معززین کے سامنے پیش کیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رابو' عشیر کے جال میں کیسے پھنس گئی۔ پیرو جی کو بلایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ کوڑھی سے جسمانی تعلق رکھنے والی عورت لازماً کوڑھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رابو کو فوراً اپنے گاؤں سے نکال دیا جائے۔ جسم کے تین کپڑوں میں رابو کو دھکے دے کر اور پتھر مار کر گاؤں سے نکال دیا گیا۔ لوگوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ماماں کے گھر کا سارا سامان اور ہر وہ شے جلا کر راکھ کر دی جس کا تعلق رابو سے تھا۔ ایک طرح سے یہ عشیر خان کے خلاف لوگوں کی دبی ہوئی نفرت کا اظہار بھی تھا۔ رابو کی بدقسمتی گاؤں سے نکل کر بھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ سر چھپانے کے لئے ایک نزدیکی قصبے "رنگوالی" میں پہنچی۔ یہاں اس کا ایک دور کا رشتے دار رہتا تھا۔ جونہی وہ قصبے میں پہنچی' اس کی رسوائی اور بدبختی کا اشتہار لگانے والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے سارا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور اہل قصبہ کو بتایا کہ اس کوڑھی کو اپنے درمیان رکھنا ان کے لئے کتنا خطرناک ہو گا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ پیرو جی کے حوالے نے پوری کر دی۔ لوگوں نے رابو کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور اسے مار بھگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کسی موذی جانور کو ہانکا جاتا ہے وہ اسے ہانکتے ہوئے قصبے سے باہر لے آئے۔ جب یہ خبر قصبے سے باہر پہنچی تو کچھ "دانش مندوں" نے مشورہ دیا کہ ایسی منحوس عورت کو آبادی سے نکالنا ہی اس

"سنگین" مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہاں سے نکل کر وہ کسی اور بستی کے لئے خطرہ بن جائے گی۔ احسن یہ ہے کہ اسے مار دیا جائے یا مروجہ طریقے کے مطابق کہیں محصور کر دیا جائے۔ چند شرپسندوں نے شدید خوف کی جو فضا پیدا کر دی تھی اس نے سیدھے سادے دیہاتیوں کو ڈھنگ سے سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ ڈری سہمی اور لڑکھڑاتی ہوئی رابو کو گھیر کر قصبے کی حدود سے باہر ایک قدیم قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ اس قبرستان کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کھنڈر اور نامعلوم مقبرہ تھا۔ علاقے کے لوگ اس جگہ کو "بیگم کا مقبرہ" کہتے تھے۔ رابو کو قرنطینہ کے لئے اسی مقام پر کسی جگہ محصور کر دیا گیا۔ اس واقعے کو اب سات آٹھ روز ہونے کو آئے تھے اور قرب و جوار میں اس کی خاصی مشہوری ہو چکی تھی۔ شکر الٰہی خود وہاں نہیں گیا تھا اور اسے تازہ ترین صورت حال کا علم نہیں تھا۔

میں جو کچھ سن چکا تھا اس کے بعد میرے سر پر آسمان بھی ٹوٹ پڑتا تو مطلق حیرت نہ ہوتی۔ مجھے لگا جیسے میں پندرہویں صدی کا انسان نہیں' قبل مسیح کی کسی تاریک بستی کا باشندہ ہوں جہاں دکھ کے بجائے دکھی کو اور مرض کے بجائے مریض کو ختم کیا جاتا ہے' جہاں اشرف المخلوقات کی کھوپڑی میں جہالت خوف بن کر سمائی ہوئی ہے اور کالے علوم کی تیرگی میں توہمات کے دیو ناچ رہے ہیں.......... کتنے صدمے کی بات تھی۔ جہاں رابو کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا تھا وہ کوئی ایسا دور دراز یا تہذیب نا آشنا علاقہ نہیں تھا۔ پختہ سڑک صرف ایک میل کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ بہت سے لوگ خود کو پڑھا لکھا بھی سمجھتے تھے۔ ان سب پڑھے لکھوں کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور کسی کو توفیق مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔

رابو پر گزرنے والی قیامت ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہی تھی۔ اس بارے میں سوچ کر میرا سینہ پھٹ رہا تھا۔ میرا دھیان فوراً رابو کی قریب ترین سہیلی کی طرف چلا گیا۔ جو کچھ وہ مجھے بتا سکتی تھی کوئی اور نہیں بتا سکتا تھا۔ خود رابو بھی نہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور راہداری میں آ کر پاگلوں کی طرح چمپا کو آوازیں دینے لگا۔ میرے تیور دیکھ کر نوکر سہم گئے تھے اور حویلی میں سکوت مرگ طاری تھا۔ میری آوازیں سن کر چمپا بھاگتی ہوئی آئی اور میرے روبرو کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر بولا۔

"دیکھو چمپا! جو کچھ پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتا دینا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں

ہو گا۔"

وہ ایک دم رونے لگی۔ میں نے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا اور خوف بھی کم ہو جائے۔ کچھ دیر بعد جب وہ نسبتاً پرسکون ہوئی تو اس نے میرے استفسار پر ایک لرزہ خیز انکشاف کیا۔ اس نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان رک رک کر بتایا۔

"مالک! جب گاؤں والوں نے حویلی میں عشیر خان کی شکایت کی تو حاجی نثار' رابو کو اپنے گھر لے گیا۔ ایک روز رابو کو عشیر خان کا رقعہ ملا۔ اس رقعے میں عشیر خان کا نام کہیں نہیں تھا لیکن رقعہ دینے والے نے بتایا تھا کہ یہ عشیر خان کی طرف سے ہے۔ اس رقعے میں عشیر خان نے رابو کو لکھا تھا کہ آپ کی (میری) زندگی سخت خطرے میں ہے اور صرف عشیر خان ہی آپ کو بچا سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ برے سے برے آدمی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کا بھی اصول ہے کہ وہ وعدہ نہیں توڑتا۔ اس نے رابو سے کہا تھا کہ وہ اس سے ایک سودا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کو بتائے بغیر پرانے ڈیرے پر اس سے ملے۔ یہ رقعہ پڑھ کر رابو کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ آپ کے لئے سخت پریشان تھی۔ پہلے اس نے یہ رقعہ بڑے مالک (میرے چچا) تک پہنچانے کا ارادہ کیا' لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ اس رات وہ خاموشی سے پرانے ڈیرے پہنچی.........." یہاں تک کہہ کر چمپا چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں پھر موسلا دھار برسنے لگیں اور زبان پر تالا لگ گیا۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ میرے پردہ سماعت پر ان الفاظ کے بم پھٹ رہے تھے جو چمپا نے کہے تھے اور نہ وہ کہہ سکتی تھی۔ صدقے اور واری جانے کے الفاظ میں نے بہت دفعہ کہے اور سنے تھے لیکن ان کا حقیقی مفہوم مجھ پر آج واضح ہو رہا تھا۔ چمپا نے اپنی ہچکیاں روکتے ہوئے کہا "اس کے بعد رابو روز رات کو پرانے ڈیرے پر جانے لگی۔ وہ گھر آ کر سارا دن روتی رہتی تھی اور شام ہوتے ہی جانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ دس پندرہ روز تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی پھر ایک رات خوشیے ارائیں کے پتر اسلم اور اس کے یاروں نے ان دونوں کو.......... دیکھ لیا۔"

اپنا بیان ختم کر کے چمپا ایک بار پھر منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ اب مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ دو روز پہلے میرے قفس کا دروازہ اچانک کیوں کھل گیا تھا۔ وہ یوں ہی نہیں کھلا تھا۔ اسے کھولنے کے لئے قربانی دی گئی تھی۔ اسے کھولنے کے لئے ایک عورت ہوس کی سیج پر لیٹی تھی اور موت کی دہشت ناک پرچھائیوں سے بغل گیر ہوئی تھی.......... ہاں.......... میری آزادی کی قیمت چکانے کے لئے کوئی گلیوں میں رسوا ہوا

تھا۔ دھکے جھیلے تھے، پتھر کھائے تھے اور خاک و خون میں لتھڑا تھا۔ یہ سب کچھ اس عورت نے کیا تھا جسے میں نے قدم قدم پر ٹھکرایا تھا اور جو ہر ہر گھڑی میرے قدموں میں اپنے جوبن اور اپنی محبت کے پھول نچھاور کرتی رہی تھی۔ اب اس خاموش پجارن نے اپنا جسم و جاں بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا اور دنیا بھر کی ملامتیں اپنے سر لے کر، دھتکاری پھٹکاری ہوئی کسی تاریک گڑھے میں اتر گئی تھی۔ رابو کا سادہ معصوم چہرہ میرے تصور میں ابھرا اور جسم کا رواں رواں رابو پکار اٹھا۔ وہ کہا کرتی تھی "آپ ہی تو میرے سب کچھ ہیں مالک" آج وہ اس فقرے کی عملی تفسیر بن کر میرے سامنے آئی تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ مجھ سے جدا اس کی کوئی ہستی نہیں۔ وہ سرتاپا میری تھی۔ میرے سپرد تھی۔ اس کے پیدا کرنے والوں نے ہی نہیں خود اس کے دل نے بھی اسے میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میں اس کا مالک تھا، سرپرست تھا، محافظ تھا، میرے ہوتے ہوئے وہ بربادیوں کا لقمہ کیسے بن سکتی تھی۔ "نہیں رابو............ نہیں میری جان میں تجھے مرنے نہیں دوں گا" میرے جسم کا ہر رواں پکار اٹھا۔ میں بھیگی آنکھوں اور دہکتے سینے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور حویلی کے صدر دروازے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

○------------☆------------○

رات تاریک اور سرد تھی۔ درختوں کے سائے تیز ہوا میں بھوتوں کی طرح رقصاں تھے۔ میں نے جیپ کو کچے راستے پر اتار کر انجن بند کیا۔ لائٹس آف کیں، اور گرم چادر جسم کے گرد لپیٹتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اعشاریہ اٹھائیس کا لوڈڈ ریوالور بمع گولیوں والی پٹی کے میری کمر سے بندھا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھ کر سمت کا اندازہ کیا اور تھوڑی بلندی پر واقع درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھا۔ اس جھنڈ کے ایک طرف رنگوالی قصبہ تھا جہاں رابو گاؤں بدر ہونے کے بعد پناہ لینے گئی تھی اور دوسری طرف پیرو جی کا گاؤں گھن پورہ تھا۔ چہار سو آسیبی خاموشی کا راج تھا۔ اس خاموشی کو وقفے وقفے سے کتوں اور گیدڑوں کی دور افتادہ آوازیں توڑتی تھیں۔ لیکن یہ اتنی مدھم تھیں کہ خاموشی ہی کا حصہ محسوس ہوتی تھیں۔ جیسے آئینے پر نرم شاخ کی ضرب لگائی جائے یا سفید سطح پر سفید چاک سے لکھا جائے۔ میں نے اونچے اونچے سرکنڈوں کے درمیان چل کر ایک خشک برساتی نالا پار کیا اور اس ٹیلہ نما جگہ پر آ گیا جہاں درختوں کا جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ روشنی کی کرن نظر آئی۔ میرے قدم خود بخود اس کرن کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی پندرہ بیس گز ہی آگے گیا تھا کہ ایک بھاری بھرکم آواز نے مجھے چونکا

دیا "کون ہے اوئے؟"

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ بائیں طرف سرکنڈوں اور گھاس پھونس میں گھری ہوئی مقبرہ نما جگہ تھی۔ بہت شکستہ عمارت تھی۔ میں دن کی روشنی میں سیکڑوں بار یہاں آچکا تھا۔ میرے بچپن کی کئی سہانی یادیں انہی نشیب و فراز سے وابستہ تھیں لیکن آج یہ سب کچھ بہت بدلا بدلا سا نظر آیا۔ سنا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے پچھلے دنوں مقبرے میں کوئی چوکیدار متعین کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس پر پھینکی۔ اندازہ درست نکلا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص اور ٹوپی میں وہ چوکیدار ہی تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اندر سے ایک شخص اور نکل آیا۔ چوکیدار نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میں نے اس کے دونوں سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "یہاں کسی بیمار لڑکی کو رکھا گیا ہے؟"

چوکیدار نے پوچھا "لیکن تم کون ہو؟"

میں نے بے انتہا سرد لہجے میں کہا "تم میرے سوال کا جواب دو۔ کیا پیرو جی کے کہنے پر یہاں کسی لڑکی کو رکھا گیا ہے؟"

چوکیدار کا ساتھی اکڑ کر بولا "میں پیرو جی کا مرید ہوں۔ مجھ سے بات کرو۔ تم تھانیدار ہو یہاں کے جو ایسے پوچھ رہے ہو؟"

میرے صبر کا پیمانہ پہلے ہی لبریز ہو رہا تھا۔ میرا زوردار تھپڑ چیلے کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ادھیڑ عمر چوکیدار نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی میں نے قمیض کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ریوالور تھا۔ اپنی جانب اٹھے ریوالور کو دیکھ کر دونوں افراد ٹھٹک گئے۔ وہ جان گئے تھے کہ ان کا واسطہ کسی عام شخص سے نہیں پڑا۔ میں نے ایک قدم چوکیدار کی طرف بڑھایا اور زور دے کر پوچھا "کہاں ہے وہ لڑکی؟"

چوکیدار نے بیس تیس گز دور روشنی کی کرن کی طرف اشارہ کیا اور بولا "اس کوٹھری میں ہے............ لیکن تم وہاں نہیں جا سکتے۔" وہ خاصا نڈر شخص تھا اور ریوالور سامنے دیکھ کر بھی خود اعتمادی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تمہارا باپ بھی مجھے نہیں روک سکتا۔ آزمانا چاہتے ہو تو قصبے سے پندرہ بیس آدمی اور منگوا لو، اور اپنے پیرو جی کو بھی بلا لو۔ میں تم سب کی لاشوں سے گزر کر وہاں تک پہنچ جاؤں گا" چوکیدار اور اس کے تنومند ساتھی کے عقب میں ایک قد آور پالتو کتا

پورے زور و شور سے بھونک رہا تھا۔ بھونکنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زنجیر کو جھٹکے بھی دے رہا تھا۔ پتا نہیں یہ زنجیر کس وقت کھل گئی یا ٹوٹ گئی۔ کتا کمان سے نکلے تیر کی مانند میری طرف آیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو موذی جانور میرا گلا دبوچ لیتا۔ میں نے تڑپ کر خود کو بچایا اور گھوم کر بے دریغ دو گولیاں کتے کے جسم میں اتار دیں۔ پر شور دھماکوں کے ساتھ ہی کتا اچھل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ یہ سب کچھ ایک ساعت کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ میرے خوفناک تیور دیکھ کر دونوں افراد بری طرح سہم گئے۔ میں نے اوپر تلے ٹرائیگر دبایا اور ان دونوں کے قدموں میں چنگاریاں بکھر گئیں۔ خود کو گولیوں کی زد میں پا کر وہ بدکے اور سرپٹ بھاگتے چلے گئے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ دونوں افراد مقبرے کے اندر آگ جلائے بیٹھے تھے اور تاش وغیرہ کھیل رہے تھے.......... ریوالور دوبارہ بھرنے کے بعد میں نے ہولسٹر میں لگایا اور اس کوٹھری کی طرف بڑھا جس کے دروازے سے مدھم سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ تانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی گول سی کوٹھڑی تھی۔ جیسے کسی مینار کا زیریں حصہ ہو۔ نہ کوئی کھڑکی' نہ روشن دان' دروازے کے باہر سے وزنی کنڈی چڑھی ہوئی تھی لیکن تالا نہیں تھا۔ میں نے کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ اندر دیے کی مدھم روشنی تھی۔ کچے فرش پر بستر کے نام پر بوسیدہ چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایلومینیم کے چند مڑے تڑے ہوئے برتن دکھائی دیئے۔ کوٹھری میں کوئی ذی حس نہیں تھا۔ بس ایک کونے میں بوسیدہ کپڑوں کی گٹھری سی رکھی تھی۔ میں نے اس گٹھری پر غور کیا اور سرتاپا کانپ گیا۔ خدا کی پناہ! اس گٹھری میں دو سہمی ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں' میں ان آنکھوں کو بمشکل پہچان سکا۔ یہ رابو تھی۔ اس کے چہرے کا جو حصہ مجھے نظر آرہا تھا وہ اس عمارت ہی کا جزو دکھائی دیتا تھا۔ کھنڈر' ویران اور آسیب زدہ' مجھے دیکھ کر رابو کی آنکھیں دہشت سے پھٹتی اور چیتھڑوں میں دھنستی چلی جارہی تھیں۔ میں نے ٹارچ اس کے چہرے سے ہٹائی اور خود کو دیے کی روشنی میں لے آیا۔ اب گٹھری میں دھنسی ہوئی آنکھوں نے مجھے پہچان لیا تھا.......... رابو مجھے دیکھتی چلی گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے وہ چیخ مارے گی اور "چھوٹے مالک" کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے گی لیکن پھر ایک دم وہ آنکھیں بجھ گئیں۔ کھلتی ہوئی گٹھری ایک بار پھر بندھ گئی۔ بندھ کر گوشے میں سمٹ گئی' سمٹ کر بے جان ہو گئی۔

"رابو" میں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا اور زخموں سے چور شخص کے مانند اس

کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔ اب اس کا چہرہ میرے مقابل تھا۔ زرد' اترا ہوا چہرہ جس پر آویزاں دو خوب صورت ہونٹ مرجھائے مرجھائے تھے لیکن اس کے باوجود یہ سب کچھ دلکش تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھائے تو وہ اور سمٹ گئی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے اسے چھونا چاہا تھا اور اس نے بدن چرایا تھا۔ ورنہ وہ تو میری آنکھ کے اشارے پر ریشمی تھان کے مانند کھلتی چلی جاتی تھی۔ "نہ چھوٹے مالک" اس نے لہجے میں قرنوں کا دکھ اور خوف سمیٹ کر کہا "مجھے ہاتھ نہ لگانا.......... میں کوڑھی ہوں.......... مجھے نہ چھونا۔"

"بکواس بند کر" میں نے بے پناہ دکھ سے کہا "کون کہتا ہے تو کوڑھی ہے۔ کہاں ہے تیرا کوڑھ۔ دکھا مجھے.......... دکھا مجھے اپنا کوڑھ" میں نے چیتھڑوں کی گٹھری میں سے اس کے دونوں ہاتھ نکالے' دونوں پاؤں دیکھے' کہیں کوئی علامت نہیں تھی۔ صرف وہ لرز رہی تھی۔ یہ لرزہ مرض کے سبب نہیں' خوف کے سبب تھا۔

وہ ہاتھ جوڑنے لگی' "نہیں مالک' میرے قریب نہ آؤ مجھ پر رحم کرو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے ٹارچ ایک جانب پھینکی اور دونوں ہاتھوں سے اس سکڑی سمٹی گٹھری پر پل پڑا نجانے وہ کس انوکھے جذبے کی لہر تھی جو میرے پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ میں بے پناہ وارفتگی سے اسے چومنے لگا' سہلانے لگا' میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ ان گولوں کی گونج میں رابو کی منت سماجت بیکار تھی۔ دفعتاً اس کوٹھری سے باہر شور سنائی دیا۔ لگا جیسے بہت سے افراد باتیں کرتے ہوئے آرہے ہوں۔ چوکیدار اور اس کے ساتھی نے میری توقع سے زیادہ تیزی دکھائی تھی۔ وہ گاؤں سے تماشیوں کو لے کر پہنچ گئے تھے میں نے رابو کو چھوڑا اور قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالتا ہوا کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ سامنے کھنڈر میں کئی لالٹینیں چمک رہی تھیں اور لاٹھیوں اور لاٹھی برداروں کے ہیولے نظر آرہے تھے پھر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"اوئے' کون ہو تم۔ باہر نکلو۔"

اس کے ساتھ ہی کسی نے اوپر تلے کئی ہوائی فائر کر دیئے۔ صورت حال نازک تھی لیکن نجانے کیا بات تھی' میرے ذہن میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریوالور تانے باہر آگیا۔ دو تین ٹارچوں کی روشنی مجھ پر پڑی۔ پھر چوکیدار کی آواز آئی "ہاں.......... یہی کتا ہے.......... یہی ہے وہ۔"

"ٹھہرو" ایک دوسری آواز نے چوکیدار کو بدکلامی سے روکا۔ اس کے بعد ایک دراز قد شخص ہجوم سے نکل کر آگے آیا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر تھا "اوہ! یہ آپ ہیں چوہدری صاحب" ٹارچ والے کی متحیر آواز ابھری۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی میری طرف بڑھے ان میں سے کئی ایک نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تنی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں اور لہجے نرم پڑ گئے۔ مجھے سب سے پہلے شناخت کرنے والا قصبے کے پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا "یہ مراد پور کے چوہدری جہانداد صاحب ہیں۔ آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔" مجھے میں سرگوشیاں ابھریں اور وہ کائی کی طرح چھٹنے لگا۔ گھنی مونچھوں والا چوکیدار سٹپٹایا ہوا کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی اپنے مردہ کتے کی طرف ماسٹر فیض محمد نے کہا۔

"چودھری صاحب! آپ نے ہمیں عزت بخشنا ہی تھی تو پہلے بتا دیا ہوتا۔"

دوسرے افراد بھی معذرت کے کلمات ادا کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ چوکیدار کو لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اچانک میرا دھیان رابو کی طرف چلا گیا۔ میں نے ریوالور ہولسٹر میں لگا کر ماسٹر فیض کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور واپس کوٹھری کی طرف آیا۔ کوٹھری میں آتے ہی میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ رابو اب وہاں نہیں تھی۔ میں یہاں سے نکلا تو دروازہ کھلا تھا۔ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر نکل گئی تھی۔ میں تیزی سے باہر آیا "رابو!" میری آواز کھنڈر میں دور تک گونجی۔ میرے انداز نے موقعے پر موجود لوگوں کو چونکا دیا۔ وہ سب متجسس ہو کر میری طرف بڑھے۔ میں نے ماسٹر فیض سے کہا۔

"لڑکی کوٹھری میں نہیں ہے۔ اسے تلاش کرو۔"

لوگ لالٹینیں اور ٹارچیں لے کر چاروں طرف لپکے.......... یخ بستہ ہوا کھنڈر سے سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ بلند و بالا درختوں کے ہیولے ان سیٹیوں کی دھن پر دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ رابو کے نکل جانے پر اظہار مسرت کر رہے ہوں۔ یکایک میرے سینے کے اندر کوئی شے چھناکے سے ٹوٹی اور ایک انتہائی سرد سیال بہہ کر میرے پورے جسم میں پھیل گیا۔ میں بے دم ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کسی آواز نے میری اندر سے پکار کر کہا۔ "چودھری جہانداد! رابو اب تجھے نہیں ملے گی۔"

○------------☆------------○

اس طوفانی شب اور اس شب کے بعد ان گنت شب و روز تک رابو کو مسلسل تلاش کیا گیا لیکن اسے نہ ملنا تھا' نہ ملی۔ رابو کی گمشدگی کا صدمہ جان لیوا تھا لیکن اس

صدمے نے میری جان نہیں لی۔ مجھے زندہ رکھا اور لحہ لحہ میرے جسم سے زندگی کشید کرتا رہا۔ یہ عمل ایسا کرب ناک تھا کہ میں زمین پر پچھاڑیں کھاتا تھا اور دیواروں سے سر ٹکراتا تھا لیکن رابو کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو توڑنا میرے بس میں نہیں تھا۔

یہ سارا عذاب میری تنہائیوں سے وابستہ تھا۔ عام لوگوں کے سامنے میں خود کو بالکل نارمل رکھے ہوئے تھا اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عشیر خان' افروزہ کو اپنی وفاداری کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔ میرا رقیب رو سیاہ جیکسن بھی میری واپسی کے روز ہی گاؤں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ بعد ازاں پتا چلا' وہ یہاں سے بھاگا تو امریکا جا کر سانس لی تھی۔ منشی خادم حسین پر کیس ختم ہو گیا تھا اور اب ایک بار پھر وہ میرا دست راست تھا۔ میرے اغوا کے معاملے میں تو وہ بے قصور تھا ہی' سیف سے رقم غائب ہونے میں بھی اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ سارا ناٹک افروزہ ہی کا رچایا ہوا تھا۔ افروزہ میری آمد کے بعد فقط دو روز حویلی میں رہی' اس کے بعد میکے جا بیٹھی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میرے پاس اس کے لئے "طلاق" کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس معاملے میں پہل کرتے ہوئے اس نے خود مجھ پر خلع کا کیس کر دیا۔ میں ایسے بھی خوش تھا۔ جہیز میں جو کچھ آیا تھا سب اسی کے نام تھا۔ عدالت میں فیصلہ ہوتے دیر نہیں لگی اور اس بیش قیمت اور خوب صورت وبال سے ہمیشہ کے لئے میری جان چھوٹ گئی۔

دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آنے لگا۔ لوگ بھولنے لگے کہ اس گاؤں میں کچھ انہونے واقعات ہوئے تھے۔ خاموش طبع رابو' منکسر المزاج دارا' خوف ناک عشیر خان اور بارعب و خوش جمال افروزہ کی صورتیں ذہن میں دھندلانے لگیں.......... صرف میں تھا جو ابھی تک ان واقعات میں الجھا ہوا تھا... صرف [illegible] تھی اوز میں تھا' جنہیں سب کچھ روز اول کی طرح یاد تھا۔ جن کے تصورات میں ہمہ وقت انگارے بھرے رہتے تھے۔ تنہائی میں رابو کی یاد میرے دل و دماغ پر آتشیں کوڑے برساتی اور میں تڑپ تڑپ جاتا۔ کچھ معلوم نہیں تھا' وہ کہاں ہے' ہے بھی یا نہیں.......... لیکن کبھی کبھی امید کے پانیوں سے یقین کی ایک بلند و بالا لہر اٹھتی اور میرے سینے کے ریگستان میں جل تھل کر دیتی۔ مجھے لگتا ایک نہ ایک دن رابو ضرور آئے گی۔ کسی سنسان دوپہر' اداس شام یا اندھیری رات میں اس کا ہاتھ میرے دروازے پر دستک دے گا اور درد کا لامتناہی موسم ایک ہچکی سے دم توڑ دے گا' لیکن یہ جان بخش واقعہ کیوں رونما ہو گا' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ کب رونما ہو گا۔ شاید ابھی' شاید دو تین

برس بعد یا شاید اس وقت جب زندگی کی بساط لپیٹنے کے لئے موت کے ہاتھ حرکت میں آچکے ہوں گے۔ مرنے والے اپنے لواحقین کو آنسو اور آنسوؤں کے بعد چین دے جاتے ہیں۔ لیکن جو کھو جاتے ہیں وہ آنسو دے کر چین اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ میرے پاس بھی آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کبھی کبھی یہ بھیگی ہوئی آنکھیں خود بخود دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور لگتا وہ ابھی دروازہ کھولے گی اور سر جھکا کر کہے گی "جی چھوٹے مالک۔"

اسی طرح دو برس گزر گئے۔ وہ گرمیوں کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ میں فارم سے تھکا ماندہ لوٹا تھا اور حویلی کے تالاب میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک ملازم بھاگا ہوا آیا تھا۔ اس نے لرزاں لہجے میں بتایا کہ حویلی کے دروازے پر رابو آئی ہے۔ وہ سخت بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ایک باریش شخص بھی ہے۔ چند لمحوں کے لئے میں سکتے میں رہ گیا۔ کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر تولیے کا گاؤن پہن کر بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک چارپائی پر پڑی جس پر ہڈیوں کا ایک ناقابل شناخت ڈھانچا رکھا تھا۔ چند اجنبی چہروں کے علاوہ ایک باریش شخص بھی یہاں موجود تھا۔ میں نے چارپائی پر پڑے ہوئے ڈھانچے کو پہچان لیا' وہ رابو ہی تھی۔ آنکھیں سفید' چہرہ زرد اور سانس سینے میں اٹکی ہوئی۔ اس حالت میں بھی اس کے سر پر اوڑھنی تھی جس نے اس کا نصف چہرا چھپا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید رابو کے اندیشے درست تھے' وہ اس مرض میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا شکار عشیر خان تھا۔ تاہم جب میں نے غور سے اس کا سراپا دیکھا تو یہ خیال غلط محسوس ہوا۔ ہڈیوں پر منڈھی ہوئی اس کی جلد صاف و شفاف تھی۔ میری نگاہ میں چند برس پہلے کا وہی منظر گھوم گیا جب اسی طرح رابو کی ماں حویلی کے دروازے پر آئی تھی۔ مجھ سے مرنے کی "اجاجت" لینے کے لئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا "آج رابو بھی یہی درخواست لے کر آئی ہے۔" دل سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ میں لڑکھڑا کر بے اختیار رابو پر جھکا۔ وہ بڑے سکون سے لیٹی تھی۔ آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ "رابو.......... رابو" میں نے اس مشت استخواں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ شاید بول ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی التجا تھی جو چند برس پہلے اس کی ماں کی آنکھوں میں تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ ذہن میں رابو کے متعلق سیکڑوں سوالات تھے لیکن جواب ایک ہی تھا..........وہ قریب المرگ ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں کہا "مجھ سے اجازت لینے

آئی ہو نا۔ مرنے کی اجازت لینے آئی ہو نا.......... نہیں اجازت میری طرف سے کوئی اجازت نہیں ہے.........."

میں نے باریش شخص سے پوچھا "بابا جی! کہاں سے لائے ہو اسے؟"

باریش شخص نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بہ آہستگی چلتا مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس شخص نے مختصر وقت میں جو کچھ بتایا اور اس کی باتوں سے میں نے جو نتائج اخذ کئے ان سے پتا چلا کہ دو برس پہلے "بیگم کے مقبرے" سے روپوش ہونے کے بعد رابو نے خود کشی کی کوشش کی تھی (رابو کی یہ کوشش اس بے پناہ خوف کے سبب تھی جو کوڑھ کے حوالے سے اس کے ذہن میں پیدا کیا جا چکا تھا) رنگوالی سے دس میل دور پختہ سڑک پر رابو اینٹوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک کے سامنے کود گئی تھی۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ وہ مرنے سے بچ گئی لیکن شدید زخمی ہوئی۔ اس کی پچھلی پسلیوں میں سخت چوٹ آئی تھی۔ ڈرائیور جو ڈرا ہوا بھی تھا' اسے ٹرک میں ڈال کر فیصل آباد کے اسپتال لے گیا۔ یہاں رابو کی کمر کا ایک آپریشن ہوا اور وہ تین ماہ زیر علاج رہی۔ وہ نیم تندرست ہو گئی تو ٹرک ڈرائیور اسے اپنے گھر لے گیا۔ وجہ یہ تھی کہ رابو نے ہزار کوشش کے باوجود اپنا پتا ٹھکانا بتانے سے انکار کیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور یہی باریش شخص تھا جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کی طرح رابو کی نگہداشت کی۔ چار پانچ ماہ بعد رابو کی تکلیف پھر بڑھ گئی اور وہ بستر سے ہلنے جلنے کے قابل نہ رہی۔ اسے پھر اسپتال پہنچایا گیا جہاں سے بغیر کسی افاقے کے وہ دو ماہ بعد پھر گھر آ گئی۔ غریب ڈرائیور جو کر سکتا تھا وہ کر چکا تھا۔ اب اس نے گھر ہی میں دیہاتی طرز کا علاج معالجہ شروع کیا۔ رابو کی حالت روز بروز پتلی ہوتی چلی گئی اور اب وہ قریب المرگ تھی۔ چند روز پیشتر رابو نے پہلی مرتبہ ڈرائیور ابراہیم کو بتایا کہ اس کا تعلق خوشاب کے مضافاتی گاؤں مراد آباد سے ہے۔ اس نے ابراہیم سے درخواست کی کہ وہ اسے ایک بار گاؤں لے جائے۔ جب تک وہ اس گاؤں نہیں جائے گی اس کی مشکل آسان نہیں ہو گی۔ نتیجے میں ابراہیم اسے اپنے ٹرک پر خوشاب لایا تھا اور وہاں سے گاؤں لے آیا تھا۔

○ ---------- ☆ ---------- ○

قارئین! یہاں میں اپنی کہانی ختم کرتا ہوں۔ رابو.......... زندہ ہے اور تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہے۔ پیسے میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ میں اسی رات رابو کے ساتھ لاہور آگیا تھا۔ اور دو روز بعد ہم ایک پاکستانی ڈاکٹر کے ہمراہ آسٹریا روانہ ہو گئے تھے۔

''ویانا'' مسیحا صفت ڈاکٹروں کی بے حد مہنگی مارکیٹ ہے۔ دنیائے طب کے قابل ترین افراد ہاتھوں میں ترازو لئے کھڑے ہیں۔ آپ اس ترازو کے ایک پلڑے میں دولت رکھتے جائیں وہ دوسرے پلڑے میں اپنا ہنر رکھتے جائیں گے۔ میں نے اس مارکیٹ میں پیسے کے زور پر ایک بے حد مہنگے آرتھوپیڈک سرجن سے رابطہ قائم کیا اور روتے ہوئے اس سے کہا ''اے مسیحا صفت! یہ ڈھانچا جو تیرے سامنے پڑا ہے اس میں ایک نہیں دو انسانوں کی جان ہے۔ مجھے آسمان پر خدا کا اور زمین پر تیرا سہارا ہے۔ یہ سادے چیک ہیں' جو چاہو ان پر بھر لینا۔ اس کے بعد میں مصلا بچھا کر سجدے میں گر گیا تھا۔

مجھے ویانا میں اب سولہ ہفتے ہو چکے ہیں اور اس دوران مراد آباد میں میری بیس مربع زمین فروخت ہو چکی ہے۔ جو باقی رہ گئی ہے وہ بھی میں رابو کی ایک مسکراہٹ پر قربان کر سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مسکراہٹ میرے نصیب میں ضرور ہو گی۔ اس لئے کہ میں نے سچے دل سے اس مسکراہٹ کی تمنا کی ہے۔ پتا نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب سے میں نے ذہن پر دل کو فوقیت دینا شروع کر دی ہے۔ وہ کوڑھ جس نے میری جمالیاتی حس کو ''بے حس'' کر رکھا تھا' خود ہی دور ہو گیا ہے۔ ہر دم اعداد و شمار کے چکر میں رہنے والا شخص اب پھولوں سے پیار کرتا ہے۔ اسے نیلے آسمان پر تیرتی سفید بدلیاں اچھی لگتی ہیں' اور بارش' جب وہ مسلسل کھڑکیوں پر برستی ہے' اور بچے جب وہ قلقاریاں مارتے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ماضی کے اس ہوشیار کاروباری شخص کو اب چھوٹے چھوٹے دھوکے کھانا بھی اچھا لگتا ہے۔

رابو کا علاج وقت طلب ہے لیکن بہتری کے آثار مسلسل نمودار ہو رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے' میں اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا ہوں۔ کل جب ہم اکیلے تھے' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ''رابعہ' مجھے چھوٹے مالک مت کہا کرو۔''

وہ لرز کر بولی ''نہیں چھوٹے مالک! مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔''

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا ''میں تم سے یہ لفظ چھین لوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھ تم سے شادی ہی کیوں نہ کرنی پڑ جائے۔''

وہ شرما گئی تھی اور میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جو عورت بستر علالت پر شرما جائے وہ بہت جلد اچھی ہو جاتی ہے۔
